خالص علمی و دینی تھا، اس لیے ان خطوط میں بھی اس کی پوری جھلک موجود ہے، یہ خطوط خاص طور پر دعوت دین کا کام کرنے والوں کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

اقلیت واکثریت کے مسائل۔ از مولانا عبد الرؤف صاحب رحانی جھنڈا نگری، صفحات ۹۰، کتابت وطباعت بہتر، پتہ قاضی مبارک اللہ، بڑھنی بازار، راولت گنج بستی۔ قیمت عہ

کتاب کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اقلیت واکثریت کے ان مسائل کا ذکر ہوگا جو آج کل کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہے ہیں، اور ان کا تفصیلی تذکرہ کرکے ان کے حل کی کچھ سیاسی اور عقلی بنیادیں فراہم کی گئی ہوں گی، مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقلیت واکثریت کا تصور سرے سے غلط ہے، غلبہ وتسلط کا تعلق دوسرے عوامل سے ہے، پھر مسلمانوں کے دور حکومت کے ایسے بہت سے تاریخی واقعات نقل کیے گئے ہیں، جن سے ان کی محکوم نوازی اور مذہبی وتہذیبی آزادی کا پتہ چلتا ہے، اس لحاظ سے کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

...اور ہندوستان جاگ اٹھا۔ از عبد القوی دسنوی صفحات ۵۰، کتابت وطباعت بہتر، پتہ شیعہ ڈگری کالج بھوپال، قیمت درج نہیں۔

نومبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان کی شمالی مشرقی اور مغربی شمالی دونوں سرحدوں پر جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں اور ایک ماہ کے اندر اندر اس نے ہزاروں میل زمین پر قبضہ کر لینے کی کوشش کی، اس جارحانہ کارروائی سے ملک کی سالمیت کو خطرہ پیدا ہوگیا، جس سے یہاں کا بچہ بچہ متاثر ہوا، چنانچہ اردو شعراء بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے پچھلی روایات کے مطابق ایسی پرجوش اور موثر رجزیہ نظمیں لکھیں کہ اگر وہ نظمیں اردو نہ سمجھنے والے فوجیوں کے سامنے بھی پورے انداز رجز کے ساتھ پڑھ دی جائیں تو ان کا جوش دوبالا ہو جائیگا، اس میں ہر خطہ اور صوبہ کے شعراء نے حصہ لیا ہے، انہی مختلف نظموں کو عبد القوی صاحب دسنوی نے "...اور ہندوستان جاگ اٹھا" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

ج، م

جلد ۹۳۔ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۴ء۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور ان پر جو کچھ گذر رہی ہے اگر وہ غور کریں تو اس میں ان کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے، اس سنت الٰہی کا قرآن مجید میں بتکرار اعلان کیا گیا ہے کہ جو قومیں احکام الٰہی سے سرتابی کرتی ہیں اور تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آتیں تو آخرت کے عذاب کے علاوہ ان کو دنیا میں بھی مختلف شکلوں میں اس کی سزا ملتی ہے، ان قوموں کے عبرت آموز واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں، یہودیوں کی تو قریب قریب پوری تاریخ موجود ہے، ان کی مسلسل سرکشی کی سزا میں ان پر جابر قوموں کو مسلط کر دیا گیا جنھوں نے ان کو حکومت اور سلطنت سے محروم اور غلام بنا کر ساری دنیا میں منتشر کر دیا، ان کا قبلہ چھین کر ان کا معبد اعظم تک مسمار کر دیا، اگر حبل من الناس یعنی امریکہ اور برطانیہ کا سہارا نہ ہوتا تو آج بھی اس کا کوئی مرکز نہ ہوتا۔

کیا مسلمانوں کی حالت ان قوموں سے مختلف ہے؟ ان کو مذہب سے برائے نام تعلق رہ گیا ہے، عمل کے لحاظ سے ان میں اور غیر مسلموں میں بہت کم فرق ہے، دینی اعمال و اخلاق کے ساتھ قومی وحدت و تنظیم، ہمدردی و مواسات، ایثار و قربانی، سعی و عمل، سادگی و جفاکشی، عزم و استقلال، جرأت و حوصلہ مندی وہ سارے اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے ہیں جن پر قوموں کی زندگی اور ان کے استحکام کا دارومدار ہے، کیونکہ یہ اوصاف کسی بڑے مقصد اور نصب العین کے تابع ہوتے ہیں، مسلمانوں کا نصب العین رضائے الٰہی اور اسلام کی شوکت و سربلندی تھی، یہی جذبہ ان میں حوصلہ مندی، بلند نظری اور ایثار و قربانی کا

ولولہ پیدا کرتا تھا، اس لیے یہ جذبہ ختم ہونے کے بعد ان کے یہ اوصاف بھی ختم ہو گئے، اور دین کے ساتھ ان سے دنیا بھی رخصت ہو گئی، موجودہ حالات ان کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ابھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔

گو مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کا شعلہ بجھ چکا ہے لیکن ابھی اس کی حرارت باقی ہے، اس کے ذریعہ ان میں دوبارہ دینی روح پیدا ہو سکتی ہے، اب ہندوستان میں ان کے لیے صحیح اسلامی زندگی کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے، جب تک ان میں مبلغوں کی اسپرٹ، مجاہدوں کا جوش و جذبہ اور صوفیوں کا اخلاق نہ پیدا ہوگا، ان کے لیے باعزت زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے، اسلامی اعمال و اخلاق ہی سے ان میں زندگی کی قوت بھی پیدا ہوگی اور دوسرے بھی ان سے متاثر ہوں گے، اس لیے ان کی موجودہ مشکلات کا علاج بھی یہی ہے، مسلمانوں کو موجودہ حالات سے گھبرا کر ہمت نہ ہارنا چاہیے، انکو ہندوستان ہی میں رہنا ہے، اور پکا مسلمان اور سچا وطن دوست بنکر رہنا ہے، اور ان دونوں کے حقوق ادا کرنا ہیں، دین سے بیگانگی نے ان کو "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بنا دیا ہے، ورنہ ان کا اصلی مقام تو ہندوستان کی رہنمائی اور اس کی اصلاح تھی، ایک زمانہ میں اسلام ان کو بہت کچھ دے چکا ہے، اور اب بھی دے سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کا مسلمان اب خود اس دولت سے تہی دامن ہو چکا ہے، ورنہ آج اس کی پوزیشن دوسری ہوتی۔

پست ہمتی اور فرار کی ذہنیت قوموں کے لیے موت ہے، مسلمانوں کے سامنے تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے، قسطنطنیہ پر پہلی فوج کشی میں وہ مجاہدانہ شریک تھے، دوران محاصرہ میں ان کا انتقال ہو گیا، موت سے پہلے یہ وصیت کی کہ میری لاش کو جہاں تک دشمن کی سرزمین میں لیجا کر دفن کر سکیں دفن کرنا، چنانچہ مسلمانوں نے تیر و تفنگ کی بارش میں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لیجا کر دفن کیا، اس واقعہ کو دیکھ کر ایک طرف رومی متحیر ہو گئے، دوسری طرف مسلمانوں میں مدفن ابو ایوبی پر قبضہ کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا،

اور ایک دن وہ آیا کہ سینٹ صوفیا پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا، ایسی حالت میں مسلمانوں کیلیے فرار کی ذہنیت اور صحیح جگہ اپنے محبوب وطن کو چھوڑنے یا عارضی حالات سے بزدل ہونے کا جذبہ کس قدر بزدلانہ ہے، ہندوستان کی سرزمین کو اندلس نہیں بنانا ہے جو مسلمان حالات سے گھبرا کر ترک وطن کا تصور ذہن میں لاتے ہیں وہ درحقیقت ہندوستان سے اسلام کا نام مٹانے کے مجرم ہیں، اور جو لوگ مسلمانوں کو جلاوطن کرنا چاہتے ہیں وہ محض تخیل کی دنیا میں رہتے ہیں، مسلمانوں کو مسلمان بنکر ہندوستان میں رہنا ہے، اور اسلام کی برکتوں کو یہاں پھیلانا ہے، قوموں کی موت وحیات دوسروں کے نہیں بلکہ خود انکے اختیار میں ہوتی ہے، آج کی دنیا میں کوئی قوت چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی نہیں مٹا سکتی، مسلمانوں کی تعداد تو اب بھی ہندوستان میں پانچ کروڑ سے زیادہ ہے جو ایک بڑی طاقتور قوم کے برابر ہے، اگر ان میں سے چند لاکھ مسلمان بھی ہندوستان میں باعزت زندگی کا عزم بالجزم کرلیں تو کوئی قوت بھی ان کو اس سے محروم نہیں کرسکتی، گر ان میں جان دین ہی سے آسکتی ہے، ہندوستان تو ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے، اس لیے موجودہ حالات کتنے ہی مخالف سہی، لیکن ایک نہ ایک دن یا وہ صحیح معنوں میں جمہوری اور سیکولر بنے گا اور اقلیتوں کو ان کے حقوق ملیں گے یا پھر خود ہندوستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

مسلمانوں کے ایک روزانہ انگریزی اخبار کی تحریک بارہا ہو چکی ہے، موجودہ حالات نے اس کی ضرورت اور بھی واضح کردی ہے، اس کے بغیر ان کی آواز حکومت کے کانوں تک بھی نہیں پہنچتی، اور ان کے مخالف پریس کی آواز پورے ہندوستان میں گونج جاتی ہے، جو ہمیشہ واقعات کی غلط تصویر دکھاتے ہیں، مسلمانوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وقتی جوش میں اگر وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں، لیکن عام حالات میں ضروری کاموں کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے انھوں نے جبلپور اور کلکتہ کے مظلومین کی امداد کے لیے جتنا روپیہ صرف کیا ہے (یہ بھی ایک ضروری کام تھا) اتنی رقم سے ایک روزانہ اخبار آسانی سے نکل سکتا تھا، اس کے بغیر ان کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوگا، پریس ہی کی قوت سے حکومت مسلمانوں کی آواز سننے پر مجبور ہوگی، اس لیے اخبار کا اجرا، مسلمانوں کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے، جس کو ہر حال پورا کرنا ہے۔

مقالات

اسلامی رصدخانے

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی، اترپردیش

(۳)

مامونی رصدگاہ کی دریافتیں

رصدگاہ مامونی کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اپنے موقر مقالہ "اسلامی رصدخانے" میں فرمایا تھا:۔

سب سے پہلا اسلامی رصدخانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد مامونی ہے۔

رصد مامونی بغداد

مامون جب تخت نشین ہوا اور تمام دنیا کے اہل کمال سمٹ کر بغداد میں آگئے اور بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ ہوا تو مامون نے اس رصدخانے کے بنانے کا حکم دیا، بغداد کے قریب ایک جگہ شماسیہ ہے وہاں کی زمین اس رصدخانے کے لیے منتخب کی گئی اور ۲۱۴ھ میں یہ رصدخانہ بنکر تیار ہوا، لیکن ۲۱۸ھ میں مامون کا انتقال ہوگیا، اس کا جانشین معتصم ایک سپاہی آدمی تھا، اس لیے یہاں کی تحقیقات کا سلسلہ صرف چند سالوں تک جاری رہا، یحییٰ بن ابی منصور اس رصدخانے کا افسر تھا جس کے ماتحت عباس بن سعید جوہری، ہند بن علی، حبش بن عبد اللہ مروزی، عمر بن محمد مروزی وغیرہ کام کرتے تھے، اس رصدخانے میں ان لوگوں نے جو تحقیقاتیں کیں وہ زیج مامونی کے نام سے چند کتابوں میں جمع کردی گئی ہیں،

ان میں سے چند مسائل یہ ہیں:-

(۱) معدل اور منطقۃ البروج کے تقاطع سے جو زاویہ پیدا ہوتا ہے اس کو اعوجاج منطقۃ البروج کہتے ہیں، اس رصد خانے میں اعوجاج منطقۃ البروج تیئیس درجہ تینتیس دقیقہ اور باون ثانیہ دریافت کیا گیا تھا، جو موجودہ تحقیقات کے بالکل قریب ہے، موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ زاویہ تیئیس درجہ ستائیس دقیقہ ہے۔

(۲) وہ دو نقطے جہاں معدل النہار اور منطقۃ البروج کا تقاطع ہوتا ہے، نقطۂ اعتدال کہلاتے ہیں، نقطۂ اعتدال کی تحقیق سے شمسی سال کے دنوں کی تعداد نہایت صحت کے ساتھ دریافت کی گئی۔

(۳) نقطۂ اعتدال کی نسبت اگرچہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ ہر سال پچاس ثانیہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس حرکت کا نام استقبال اعتدالین ہے، اس رصد خانے میں استقبال اعتدالین بھی دریافت کیا گیا تھا۔

(۴) آفتاب کے مقامات اوج اور مقدار میل و خروج مرکز کی بھی تحقیق کی گئی

(۵) ثوابت اور سیاروں کے بعض حالات بھی یہاں دریافت ہوئے۔

رصد مامونی دمشق

تحقیقات رصدیہ کی مزید تحقیق کے لیے عموماً مختلف مقامات پر چند رصد خانے بنائے جاتے ہیں، تاکہ اگر کل رصد خانوں کا کسی ایک تحقیق پر اتفاق ہو جائے تو وہ مسئلہ بالکل صحیح تسلیم کر لیا جائے، بغداد کے رصد خانے کی تصحیح کے لیے دمشق میں کوہ قاسیون کے دامن میں بھی مامون نے ایک رصد خانہ بنوایا تھا، غالباً اس کا سنہ تعمیر بھی بغداد کے رصد خانے کے موافق ہوگا۔" (ماخوذ از رسالہ الندوہ، مارچ ۱۹۰۹ء)

غالباً یہ جائزہ قاضی صاعد اندلسی کی طبقات الامم سے ماخوذ ہے جس میں اسکی تفصیل درج ہے (۶۰-۹) ان ہیئتی سرگرمیوں کی تفصیل ابن یونس نے "زیج حاکمی" میں دی ہے جس کا خلاصہ قانون مسعودی وغیرہ سے حاصل شدہ معلومات کے ساتھ ذیل میں دیا جا رہا ہے:-

میل کلی:- میل کلی یا میل اعظم کی تعریف جسے سید صاحب نے "اعوجاج منطقۃ البروج" سے تعبیر کیا ہے، جو البیرونی نے قانون مسعودی میں دی ہے، چنانچہ مقالہ اربعہ کے باب اول کا عنوان ہی یہ ہے:-

"مقدار زاویۃ تقاطع معدل النہار مع منطقۃ البروج وھو المیل الاعظم"[1]

دوسری تعریف متاخرین کی ہے، جس کی رو سے دائرہ مارہ باقطاب اربعہ کی وہ قوس جو معدل النہار اور منطقۃ البروج کے مابین ہوتی ہے، میل کلی کہلاتی ہے، اسی کی دریافت کی طرف قاضی صاعد نے "مقدار میلہا" سے اشارہ کیا ہے، بہر حال قاضی زادہ نے شرح چغمینی میں اس تعریف میں لکھا ہے:-

"وغایۃ المیل ویقال لہا المیل الکلی ..... والمیل الاعظم لکونہا اعظم من غیرہا قوس بینہما الی بین المعدل ودائرۃ البروج من الدائرۃ المارۃ باقطاب الاربعۃ فانہا ھی المارۃ بالانقلاب"۔ (Solestice)

اسی طرح "تصریح" میں ہے:-

"وتقطع المارۃ (دائرۃ المارۃ باقطاب الاربعۃ) الثانیہ (منطقۃ البروج) علی الانقلابین (الانقلاب الصیفی والانقلاب الشتوی) .... واقصر قوس منہا (من الدائرۃ المارۃ باقطاب الاربعۃ) بینہما (بین منطقۃ البروج ومعدل النہار) او بین قطبیہما ہو المیل الکلی"۔

"میل کلی" کی مقدار حسب تصریح البیرونی قدیم ہند و جوتشیوں کے نزدیک متفقہ طور پر ۲۴ درجے تھی:-

"فاما مقدار ہذا المیل الذی بقدر الزاویۃ الحادثۃ من تقاطع معدل النہار ومنطقۃ البروج فاتفاق فرق الہند فیہ علی انہ اربع وعشرون جزءاً"[2]

البیرونی لکھتا ہے کہ قدیم یونانی ہیئت داں (مثلاً اقلیدس) بھی اسے ۲۴ درجہ مانتے تھے، چنانچہ

---

[1] قانون مسعودی جلد اول ص ۱۰۳ [2] ایضاً ص ۳۶۳

ابن الجاثیقی "حل شکوک اصول اقلیدس" میں لکھتا ہے کہ اسی مقدار کی بنا پر اقلیدس نے کتاب الاصول کے چوتھے مقالہ (شکل گیارہ) میں دائرہ کے اندر شکل مخمس بنانے کا عمل لکھا تھا[1]

لیکن بطلیموس اور اس کے پیشروؤں ایراتوستھینس (اراطیسانس) اور ابرخس (Hipparchus) کے نزدیک یہ ۲۳° - ۵۱' - ۲۰'' تھی[2]۔

رصد گاہ مامونی میں میل کلی کو دریافت کیا گیا، جو حسب تصریح عمر بن محمود الجغمینی وقاضی زادہ رومی ۲۳ درجے ۳۵ دقیقے تھی،

"نهاية ميل دائرة البروج عن معدل النهار ومقدارها كج له اى ثلث وعشرون جزءً وخمس وثلثون دقيقة على ما وجد بارصاد المامون"[3]

مگر البیرونی نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن ابی منصور نے شماسیہ بغداد میں اسے ۲۳° - ۳۳' پایا تھا، اس سے پہلے مرو کے ہیئت دانوں نے اس (یحییٰ بن ابی منصور) کی سرکردگی میں بھی اتنی ہی مقدار دریافت کی تھی، خالد بن عبد الملک المروزی نے رصدگاہ دمشق میں اسے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ اور ۵۲ ثانیہ پایا تھا۔ خود سند بن علی کا خیال ہے کہ یہ ۲۳° - ۳۳' - ۵۷'' ہے[4]

وسط شمس:- ۲۱۵ھ (مطابق ۱۹۹ یزدجرد) میں یحییٰ بن ابی منصور نے اسے یاکط مہ مہ ید (حسب ترتیب فرانسیسی = ۱۱ - ۲۹° - ۴۵' - ۴۵'' - ۱۴''') پایا تھا، جو مبسوط ہو کر ۳۵۹° - ۴۵' - ۴۵'' - ۱۴''' آتا ہے۔ (یہ مقادیر زیج حاکمی ابن یونس سے ماخوذ ہیں)

"اما وسط الشمس بمذهب يحيى بن ابى منصور فانه فى السنة الفارسية
ياكط مه مه يد ثالثة يكون مبسوطها شنط مه مه يد"[5]

لیکن البیرونی اپنے حساب سے آفتاب کی اوسط حرکت یومیہ کو ۰ - ۵۹ - ۸ - ۲۰ - ۵۸ - ۱۲ - ۲۳ بتاتا ہے۔

۱و۲؎ قانون مسعودی ج اول ص ۳۶۳ ۳؎ شرح چغمینی ص ۲۰، ۴؎ قانون مسعودی ج اول ص ۳۶۳ ۵؎ زیج ابن یونس ص ۲۱۵

"خرج مسير الشمس ليوم ۔ ۔ نط ۔ ح ۔ ك ۔ لح ۔ كا ۔ لج ۔۔۔۔۔"[1]

اسی طرح شرح چغمینی میں وسط شمس "نیز" خارج "شمس کی اوسط حرکت روزینہ ۰° - ۵۹' - ۸'' - ۲۰''' مذکور ہے۔ اول الذکر کے بارے میں مرقوم ہے:-

"وهى فى كل يوم بليلته ها نط ح ك اى تسع وخمسون دقيقة وثمان ثوان وعشرون ثالثة ..... وهى مثل وسط الشمس"

اور موخر الذکر کے بارے میں تحریر ہے،

"حركة الفلك الخارج المركز للشمس حول مركزه الخارج ..... فى اليوم بليلته ها نط ح ك اى تسع وخمسون دقيقة وثمان ثوان وعشرون ثالثة"۔

جملہ تعدیل شمس:- ۱° - ۵۹' "وجملة تعديلها فانه انط دقيقة"

اوج شمس:- برج جوزا ۲۲° - ۹' - ۳۹'' (۲۱۵ھ مطابق ۱۹۹ھ یزدجرد)

حرکت قمر:- سن فارسی میں ۴ - ۹° - ۲۳' - ۵'' - ۵۱''' ثالثہ (واما القمر فانه حركة عند يحيى بن ابى منصور فى السنة الفارسية وط كج ه ثالثة)

حرکت خاصہ قمر:- سن فارسی میں ۲ - ۲۸° - ۴۳' - ۴۴'' - ۷''' - ۲۸ - ۱۷ رابعہ

وسط الجوزہر:- ۱۹° - ۳۳'' - ۴۴''' ثالثہ

جملہ تعدیل القمر ۵° درجہ

وسط زحل:- ۱۲° - ۱۳' - ۳۹'' - ۳۳''' ثالثہ

تعدیل مرکز زحل:- ۶° - ۳۱' دقیقہ

تعدیل اوسط زحل:- ۶° - ۱۳ دقیقہ

۱؎ قانون مسعودی جلد ثانی ص ۶۴۵

اوج زحل :- ۸ - ۴ - ۳ (مطابق ۱۹۹ سنہ یزدجرد)

وسط مشتری :- صفر - ۲۰ - ۳۸ - ۱۲''' ثالثہ

تعدیل مرکز مشتری :- ۵ - ۱۵ دقیقہ

تعدیل اوسط مشتری :- ۱۱ - ۳۴ دقیقہ

اوج مشتری :- ۵ - ۲۲ - ۳۲ دقیقہ (مطابق ۱۹۹ سنہ یزدجرد)

وسط مریخ :- ۶ - ۱۱ - ۱۷ - ۱۱'' - ۲۷''' ثالثہ

تعدیل مرکز مریخ :- ۱۱ - ۲۵ دقیقہ

تعدیل اوسط مریخ :- ۴۱ - ۹ دقیقہ

اوج مریخ :- ۳ - ۳ - ۳۳ دقیقہ

حرکت خاصہ زہرہ :- ۷ - ۱۵ - ۲ - صفر - ۲'' ثالثہ

تعدیل مرکز زہرہ :- ۱ - ۵۹ دقیقہ

تعدیل اوسط زہرہ :- ۴۵ - ۵۹ دقیقہ

اوج زہرہ :- مثل اوج شمس

حرکت وسطی عطارد :- ۱ - ۲۳ - ۵۶ - ۴۲'' - ۳۳''' ثالثہ

تعدیل مرکز عطارد :- ۸ - ۲ دقیقہ

تعدیل اوسط عطارد :- ۲۲ - ۲ دقیقہ

اوج عطارد : ۶ (میزان) ۲۱ - درجہ[1]

رصد گاہ مامونی کی دریافتوں کو آپ نے دیکھا، ماہرین کی رائے

رصد گاہ مامونی کی دریافتیں انتہائی احتیاط اور غیر معمولی

۱؎ یہ پوری تفصیل زیج ابن یونس کے چھٹے باب سے ماخوذ ہے، ص ۲۱۵ تا ص ۲۲۱

جانچ پڑتال کے بعد قلمبند کی گئی تھیں، اس لیے اسے "الزیج الممتحن" (Tested Tables) کہتے تھے، بعد کے ہیئت دانوں نے "المجسطی" کی طرح اس کو بھی اپنا معمول بنایا۔

اسی فرط اعتنا کا نتیجہ تھا کہ بعض اہل فن نے اسے حریفانہ تنقید کا موضوع بنایا۔ ان حریف نقادوں میں ابن یونس خاص طور سے قابل ذکر ہے، چنانچہ "زیج حاکمی" کا چوتھا باب جس کا عنوان

الباب الرابع فی کواکب الزیج الممتحن وغلط من غالی فی صحتہ[1]

ہے ان لوگوں کی تغلیط میں ہے جنھیں اس کی صحت کے باب میں غیر معمولی خوش فہمی تھی، یہی نہیں، بلکہ ابن یونس نے اس سلسلے میں اپنے پیشرووں کی نکتہ چینی کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً اس نے ثابت ابن قرہ کے ایک رسالہ کا اقتباس نقل کیا ہے، جو اس نے قاسم بن عبید اللہ کو بھیجا تھا اور اس میں لکھا تھا:-

امر الحساب الممتحن جعلت فداک	زیج ممتحن میں مرقوم حسابات نہ تو مکمل ہوئے
ما تم ولا قارب بالتمام[2]	اور نہ تکمیل کی حد تک پہنچے

اسی طرح اس نے ایک خط اسحاق بن حنین کو لکھا تھا جس میں تحریر کیا تھا کہ "زیج ممتحن کی کوتاہیوں کی وجہ آفتاب کی ترصید میں بے احتیاطی تھی"[3]

خود ان مشاہدات کے متولیوں میں بھی ان کے متعلق اختلاف تھا، چنانچہ سند بن علی جو دونوں رصدوں میں شریک تھا، یحیی بن ابی منصور کے ارصادات سے متفق نہ تھا، اسی طرح اور لوگوں نے بھی جو ان کے زمانہ کے قریب تھے، ان ارصادات پر اعتراض کیے تھے، ابن یونس لکھتا ہے:-

فاما طعن کثیر من علماء اهل	یہاں کے معاصرین نیز ان لوگوں کے اعتراضات
زمانهم ومن قرب منهم علی	جو ان کے زمانہ سے قریب تھے، تو ابو معشر بلخی
ارصادهم فان ابا معشر طعن علیها	اور علی بن اسحاق بن کسوف نے ان کے

۱؎ زیج ابن یونس ص ۹۰، ۲؎ ایضاً ص ۹۹ ۳؎ ایضاً ص ۴۴

وعلی بن اسحٰق بن کسوف وسند
بن علی وقد حضر الرصدین
(زیج ابن یونس ص ۴۳)

ارصادات پر اعتراضات کیے تھے، نیز سند
ابن علی نے بھی جو بذات خود دمشق اور بغداد
دونوں جگہ کی رصد گاہوں میں شریک تھا، اعتراض کیے تھے۔

سند بن علی نے ان کوتاہیوں کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یحیی بن ابی منصور نے جس ذات الحلق کی مدد سے یہ مشاہدات کیے تھے، وہ زیادہ دقیق نہ تھا، صرف دس دس دقیقوں کے نشانات پر منقسم تھا[1]، بنو موسیٰ نے بھی جنھوں نے رصد گاہ مامونی کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی رصد گاہ قائم کی تھی، "زیج ممتحن" کے مرصودات سے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے، اسی طرح الماہانی اور سہل بن بشر نے اپنے مرصودات "زیج ممتحن" کے مرصودات سے مختلف پائے، چنانچہ ابن یونس لکھتا ہے:۔

"وذکر بنو موسیٰ ابن شاکر فی ارصادلھم کثیرۃ خلافھم وکذلک الماھانی وسھل بن بشر۔"[2]

بہرحال زیج ابن یونس کا چوتھا باب ان لوگوں کے ارصاد کی تفصیل پر مشتمل ہے، جن میں عیان ومحسوس (ارصادی مشاہدات) ان نتائج سے مختلف پائے گئے، جو "زیج ممتحن" کے حساب سے آنا چاہیے تھے، یہ اختلافات احمد بن عبد اللہ المعروف بحبش ہی کے زمانہ سے شروع ہو گئے تھے، جس نے رصدگاہ مامونی کے زمانہ میں نئے ارصاد کرنا شروع کر دیے تھے، اور بعد میں تو الماہانی وغیرہ بالخصوص بنو امار جود اور ابن یونس نے اپنے مرصودات کو "زیج ممتحن" کے حسابات سے بہت زیادہ مختلف پایا،

محیط ارضی کی پیمائش لیکن رصد گاہ مامونی کا سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے:۔

"مامون کو علوم الاوائل (قدیم علم وحکمت) کی تحقیق سے بڑا شغف تھا، اس نے کتابوں میں لکھا دیکھا تھا کہ کرۂ زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل ہے ...... مامون نے اس کی اصلیت پر واقف ہونا چاہا تو

---

[1] زیج ابن یونس ص ۱۵۔ [2] ایضاً ص ۴۳

اس نے بنی موسیٰ سے پوچھا۔ انھوں نے کہا بیشک یہ بات صحیح ہے، مامون نے کہا میں چاہتا ہوں کہ جس طریقہ کا متقدمین نے ذکر کیا ہے تم بھی اس کے مطابق عمل کرو، تاکہ ہم دیکھیں کہ آیا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں، چنانچہ انھوں نے ہموار اور چورس زمین کو تلاش کیا جو صحرائے سنجار اور کوفہ میں ملی، اس کے بعد وہ ایک جماعت کو لیکر جن پر مامون کو اعتماد تھا، سنجار پہنچے، وہاں وہ ایک مقام پر ٹھہرے اور آلات رصدیہ کی مدد سے قطب شمالی کا ارتفاع دریافت کیا، اور اس مقام پر ایک میخ گاڑ دی اور اس میں ایک لمبی رسی باندھ دی اور پھر وہ بائیں مڑے ہوئے ٹھیک شمالی سمت میں چلے، جب رسی ختم ہو گئی تو زمین میں دوسری میخ گاڑ کر پھر رسی باندھ دی، اور پہلے کی طرح شمالی سمت میں چلے، وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں قطب شمالی کا ارتفاع ایک درجہ زیادہ ملا۔ اسکے بعد درمیانی زمین کو رسیوں کی مدد سے ناپ لیا، پس یہ فاصلہ ۶۶ $\frac{2}{3}$ میل نکلا، پھر وہ اس مقام پر آئے جہاں پہلی میخ گاڑی تھی، اور پھر رسی باندھکر ٹھیک جنوب کی طرف چلے اور پہلے کی طرح میخوں کو گاڑتے ہوئے اور رسیاں باندھتے ہوئے آگے بڑھے، یہاں تک کہ وہ رسیاں ختم ہو گئیں جنھیں شمالی جہت میں استعمال کیا تھا، پھر انھوں نے اس مقام پر قطب شمالی کا ارتفاع ناپا اور معلوم کیا کہ وہ پہلے سے ایک درجہ گھٹ گیا ہے، اس سے ان کا حساب صحیح ہو گیا، اور جس بات کا ارادہ کیا تھا، اس کی تحقیق ہو گئی۔"

(وفیات الاعیان جلد ثانی ص ۷۹-۸۰)

لیکن مامون نے اسی تجربہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دوسرے مقام پر بھی اس کا تجربہ کرا کے اس تحقیق کی مزید تصدیق کی، چنانچہ ابن خلکان آگے چل کر لکھتا ہے:۔

فلما عاد بنو موسیٰ الی المامون و
اخبروہ بما صنعوا وکان موافقا لما
رآہ فی الکتب القدیمۃ من استخراج

جب بنو موسیٰ لوٹ کر مامون کے پاس آئے اور
اپنے تجربہ کی اطلاع کی اور یہ تجربہ اسکے مطابق تھا
جو مامون نے قدیم کتابوں میں متقدمین یونانی حکما

الاوائل طلب تحقیق ذلک فی موضع آخر فسیرهم الی ارض الکوفة و فعلوا فی سنجار فتوافق الحسابان فعلم المامون صحة ما حرره القدماء فی ذلک (وفیات الاعیان ج ۲ ص ۸۰)

کی اس دریافت کے بارے میں دیکھا تھا تو اس نے انکی مزید تحقیق دوسری جگہ کرانا چاہی اور انھیں کوفہ کی طرف بھیجا، وہاں انھوں نے اس عمل کو جو سنجار میں کر چکے تھے، دہرایا، اس طرح دونوں حساب ایک دوسرے کے موافق ہوگئے، اور قدما نے اس باب میں جو کچھ لکھا تھا، مامون کو اسکی صحت کی تصدیق ہوگئی۔

ابن خلکان نے رصدگاہ مامونی کی اس دریافت کو بنو موسیٰ کا کارنامہ بتایا ہے، چنانچہ انکے تذکرے میں لکھتا ہے:-

ومما اختصوا به فی ملة الاسلام واخرجوه من القوة الی الفعل و ان کان ارباب الارصاد المتقدمون علی الاسلام قد فعلوه ولکنه لم ینقل ان احدا من هذه الملة تصدی وفعله الا هم (ایضاً ص ۷۹)

اور بنو موسیٰ کا امتیازی کارنامہ جس کے لیے وہ تاریخ اسلام میں ممتاز ہیں اور جسے انھوں نے عمل کرکے دکھایا (محیط ارضی کی پیمائش ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) اگرچہ اسلام سے پہلے کے فلکیاتی مشاہدات کرنے والے ہیئت داں اسکو کر چکے تھے، لیکن ملت اسلامیہ کی تاریخ میں کسی ہیئت داں کے متعلق یہ منقول نہیں ہے کہ اس نے یہ کام (محیط ارضی کی پیمائش) انجام دیا ہو، سوائے بنو موسیٰ کے۔

مگر یہاں ابن خلکان سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ رصدگاہ مامونی کا قیام ۲۱۴ھ میں ہوا تھا، اسی زمانہ میں مامون الرشید کے حکم سے صحرائے سنجار میں محیط ارضی کی پیمائش کی گئی، اس کے بعد وہ غزوۂ روم پر چلا گیا، (جہاں اس کی وفات ہوئی) اس زمانہ میں (۲۱۸ھ کے قریب) بنو موسیٰ جنھیں ان کا باپ مرتے وقت مامون کو سپرد کر گیا تھا، ہنوز بچے تھے، اور مامون نے انھیں اسحٰق بن ابراہیم المصعبی کی تربیت میں دیدیا تھا، اور

روم سے برابر اس کو ان کی خبرگیری کے لیے لکھتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اسحاق ان پیہم یاددہانیوں سے گھبرا گیا اور کہنے لگا کہ مامون نے تو مجھے ان بچوں کی دایہ بنادیا، چنانچہ ابن القفطی لکھتا ہے:-

مات (ابوهم) وخلف هؤلاء الاولاد الثلاثة صغارا فوصی بهم المامون اسحاق بن ابراهیم المصعبی واثبتهم مع یحیی بن ابی منصور فی بیت الحکمة وکانت کتبه ترد من بلاد الروم الی اسحق بان یراعیهم ویوصیه بهم ویسئل عن اخبارهم حتی قال جعلنی المامون دایة لاولاد موسی بن شاکر" (اخبار العلما باخبار الحکما، ص ۲۸۷)

ان کے باپ کا انتقال ہوگیا، اور اس نے یہ تین چھوٹے بچے چھوڑے، مامون نے انھیں اسحٰق ابن ابراہیم المصعبی کی نگرانی میں دیدیا، اور بیت الحکمۃ میں یحییٰ بن ابی منصور کی اتالیقی میں رکھا، جب مامون روم گیا تو وہاں سے اس کے خط برابر اسحٰق کے پاس آتے رہتے کہ انکی نگہداشت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے، وہ برابر انکے متعلق اسے توجہ دلاتا رہتا اور انکی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اسحٰق گھبرا کر کہنے لگا کہ مامون نے تو مجھے موسیٰ بن شاکر کے بچوں کی دایہ بنادیا ہے۔

اس لیے ابن خلکان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ محیط ارضی کی پیمائش کے اس اہم تجربہ کو بنو موسیٰ نے انجام دیا تھا، بلکہ یہ تجربہ رصدگاہ مامونی کے منتظمین نے کیا تھا، جن میں سند بن علی، خالد بن عبدالملک المروروذی، علی بن عیسیٰ الاصطرلابی، اور احمد (علی) البختری[1] خاص طور سے مشہور ہیں۔

سائنٹفک طور پر محیط ارضی کی پہلی پیمائش اسکندریہ کے مدرسۂ فلسفہ و حکمت کے مشہور یونانی جغرافیہ داں و ہیئت داں ایراٹوستھینس (Eratosthenes) (زمانہ ۲۷۶ لغایت ۱۹۵ ق م) نے کی تھی، انقلاب صیفی (Summer Solstice) کے موقعہ پر اس نے

[1] ابن یونس نے اس کا نام علی بن البختری دیا ہے، مگر البیرونی نے "تحدید نہایات الاماکن" میں اس کا نام احمد بن البختری اور کتاب التفہیم (فارسی) میں ابو البختری بتایا ہے۔

معلوم کیا کہ شہر اسکندریہ میں دوپہر کے وقت خط سمت الراس سے سورج کا زاویائی فاصلہ پورے محیط کا ۱/۵۰ یا تقریباً ۷° ہوتا ہے، حالانکہ اسی وقت بالائی مصر کے شہر اسوان میں سورج کا سمت الراس پر ہونا مشہور و معروف تھا، اور یہ فرض کرکے کہ اسوان اسکندریہ کے ٹھیک جنوب میں واقع ہے، ایراٹو ستھینس نے اس مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسوان سے اسکندریہ کا فاصلہ زمین کے محیط کا ۱/۵۰ ہے اور چونکہ یہ فاصلہ ۵۰۰۰ اسٹیڈیا تھا، لہذا اس نے تخمینہ لگایا کہ زمین کا محیط ۲۵۰۰۰۰ اسٹیڈیا ہے، بعد میں اس عدد کو ۲۵۲۰۰۰ میں بدل دیا گیا تاکہ خط نصف النہار کے ارضی کے ہر درجہ کا طول ۷۰۰ اسٹیڈیا ہو جائے۔[1]

مسلمان ہیئت داں بھی ایراٹو ستھینس کی اس کاوش سے ناواقف نہ تھے، چنانچہ البیرونی "قانون مسعودی" میں لکھتا ہے:-

وقال قد روى الروم بمقدار	اور اہل روم (یونانیوں) نے زمین کی پیمائش
سماه اسطاذيا وزعم جالينوس	"اسٹیڈیا" نام پیمانہ سے کی تھی۔ جالینوس کا خیال ہے
ان اراطشانوس قد ربه ما بين	کہ ایراٹو ستھینس نے شہر اسوان اور اسکندریہ کے
بلدي اسوان والاسكندريه	درمیانی فاصلے کو اسی پیمانے سے ناپا تھا کیونکہ یہ دونوں
فانهما على خط واحد من خطوط	ایک ہی خط نصف النہار پر واقع ہیں، جیسے شہر
انصاف النهار مثل بلدي تدمر	تدمر اور رقہ، لیکن جالینوس کی تصنیف "کتاب البرہان"
والرقه ومتى جمع ما في كتاب البرهان[2]	میں جو کچھ مذکور ہے، اگر اس کا مقابلہ بطلیموس کی
لجالينوس الى ما في كل واحد	کتاب "المدخل الی الصناعۃ الکریۃ" نیز "صورۃ الارض"
من كتاب بطلميوس في المدخل الى	(جغرافیا) کے محتویات سے کیا جائے تو پیمائش کی

[1] Berry: Short History of Astronomy. P. 39-40

[2] کتاب البرہان جالینوس کی کتاب تھی جو فن منطق پر تھی، پندرہ مقالے تھے، اسکے کچھ مقالوں کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا تھا اور کچھ کا ترجمہ جبرئیل بن بخت یشوع نے ایوب سے کرایا تھا۔

الصناعة الكرية وكتابه في صورة	مقداروں میں بڑا تفاوت نظر آتا ہے (جالینوس نے
الارض تفاوتت المقادير ايضا على	یہ فاصلہ ۷۰۰ اسٹیڈیا اور بطلیموس نے ۵۰۰ اسٹیڈیا
ان اسماء تقديراتهما اذا وقعت	بتایا ہے) اس کے ساتھ (یہ بھی بات ہو کہ) ان کے
الينا لم يكد يهتدى بها قوما بسبب	مستعملہ پیمانوں (اسٹیڈیا) کے نام بسبب غیر زبان
اللغة واختلاف المفسرين فيها۔[1]	ہونے نیز مفسرین (کتب یونانی) کے اختلاف تعبیر
(قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۲۸-۵۲۹)	کے ہمارے سمجھنے میں آسان نہیں ہیں۔

البیرونی دوسری جگہ کہتا ہے کہ اراطشانوس (ایراٹو ستھینس) کے حساب کے مطابق خط نصف النہار ارضی کے ایک درجہ کا فاصلہ جالینوس نے "کتاب البرہان" میں ۷۰۰ اور بطلیموس نے "جغرافیا" میں ۵۰۰ اسطاذیا (اسٹیڈیا) بتایا ہے، لیکن "اسطاذیا" کے معنی معلوم نہیں، اور ہمارے یہاں جو پیمانے مستعمل ہیں ان میں ان کی مقدار کو بیان نہیں کیا جا سکتا، اسی وجہ سے مامون الرشید کے زمانہ میں اس تجربہ کی تجدید کرائی گئی۔[1]

بہر حال البیرونی نے ایراٹو ستھینس کے تجربہ کے بعد عہد مامونی کے ہیئت دانوں کی کوشش کا ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

ولهذا اوالتفاوت العظيم بين رأى	اسی (اسطاذیا کی لمبائی معلوم نہ ہونے) نیز جالینوس
الفريقين فيها هو الذى بعث المامون	اور بطلیموس کی رایوں میں اختلاف ہونے کی وجہ سے مامون الرشید
بن الرشيد على تجريد الاعتبار	کو خیال ہوا کہ علاقہ موصل میں صحرائے سنجار کے اندر اس
في برية سنجار من ارض الموصل	فن کے ماہرین سے اسکی (محیط ارضی کی) پیمائش کی
على يد جماعة من المتقدمين في	تحقیق کرائے، چنانچہ ان لوگوں نے دائرہ عظیمہ
هذه الصناعة۔ فقصدوا معرفة	کی ایک ایسی قوس کو جو تمام دور (محیط) کیسا

[1] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۱

ما يخص قوسا من دائرة عظمى معلومة
النسبة الى كل الدور من اذرع او
اميال او فراسخ ....

وحين احتاطوا فيه وجدوا حصة
الجزء الواحد من الثلاث مائة و
الستين المفروضة لكل الدور
ستة وخمسين ميلا وثلثي ميل، كل
ميل منها اربعة آلاف ذراع
تعرف بالسوداء ....

ولذلك يكون اذرع هذا الجزء
مائتين وست وعشرين الفا وست
مائة وست وستين ذراعا و
فراسخه ثمانية عشر فرسخا وثلث
وخمسون دقيقة وثلث دقيقة
واذرع الدور كله ۸۱۶
واميالہ ..۲۰۴۰۰ وفراسخه ۶۸۰۰[1]

ایک نسبت معلومہ رکھتی ہو گزوں، میلوں اور
فرسخوں میں ناپنے کا ارادہ کیا ....
....

اور پوری احتیاط ملحوظ رکھنے کے بعد انھوں نے
محیط ارضی کے ۳۶۰ درجوں میں سے ایک درجہ کی لمبائی
۵۶ ۲/۳ میل پائی، ہر میل ۴ ہزار گز کا تھا جو
ذراع سوداء کے نام سے مشہور تھا۔ .....
....
....

لہذا ایک درجہ میں ۲۲۶۶۶۶ گز اور
۱۸ ۵۳ ۱/۳ / ۶۰ فرسخ ہوتے ہیں اور پورے
محیط میں آٹھ کروڑ سولہ لاکھ گز یا بیس ہزار
چار سو میل یا چھ ہزار آٹھ سو فرسخ ہوتے ہیں

اسی طرح وہ "کتاب التفہیم" (عربی) میں اس پیمائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

لما لم تكن تحصل الحقيقة مما ترجم

جب (یونانی) کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں

[1] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۲۹ – ۵۳۰

من الكتب الى اللسان العربي
امر المامون بن الرشيد باعتبار
ذلك فتولاه جماعة من العلماء
وقتئذ في برية سنجار ووجدوا
حصة الدرجة الواحدة
من الاميال ستة وخمسين
ميلا وثلثا ميل بذراع السوداء
وضربوا ذلك في ثلثمائة وستين
فاجتمع عشرون الفا واربع
مائة وذلك اميال دور الارض
في الدائرة العظمى ..... وكل
ميل فهو مشتمل على اربعة
آلاف ذراع يسمى بالعراق
سوداء[1]

اور ان سے حقیقت حال معلوم نہ ہو سکی تو
مامون الرشید نے اسکی (محیط ارضی کی پیمائش کی)
تحقیق کا حکم دیا اور اس کام پر اس وقت کے
علما کی ایک جماعت مامور ہوئی، انھوں نے
صحرائے سنجار میں محیط ارضی کے ناپنے کا تجربہ کیا،
اور ایک درجہ کا طول ۵۶ ۲/۳ میل پایا (سوداء
گزوں کے حساب سے) اسے ۳۶۰ میں ضرب دیا تو
محیط زمین کا طول ۲۰۴۰۰ (بیس ہزار چار سو)
میل آیا .... اور ہر میل
۴۰۰۰ (چار ہزار) گزوں پر مشتمل ہوتا ہے
جو عراق میں سوداء کہلاتے ہیں

اسی طرح وہ (البیرونی) "کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم" (فارسی) میں لکھتا ہے:۔

"وزیں جہت چوں کتابہا بتازی ہمی گردانیدند و آں اندازہا بحقیقت دانستہ نیامد مامون خلیفہ پسر ہارون الرشید فرمودہ است تا اندازۂ زمیں از سر نو آزمودہ آید۔ و گروہے را از دانایان چون

[1] کتاب التفہیم عربی، ص ۱۱۸ مرتبہ ریمزے رائٹ۔ مسٹر ریمزے رائٹ نے برٹش میوزیم کے نسخہ تفہیم (عربی) [نمبر Or. 8349] کو جو ۴۲۰ھ کا مکتوبہ ہے، محدود تعداد [صرف سو عدد] میں ۱۹۳۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں ہے، میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

خالد مروروذی و بو البختری ساح و علی بن عیسیٰ اسطرلابی و گروہے مانند ایشان بفرستادہ است سوئے دشت سنجار تا طریق آں بکار داشتند و حصہ یکے درجہ بیافتند از دائرہ بزرگ بر زمین، پنجاہ و شش میل و چہار دانگ میل و آنرا بسی صد و شصت زدند تا میلہائے دور زمین گرد آمد بیست ہزار و چہار صد و ہر میلے سہ یک فرسنگ بود و میل چہار ہزار ارش سودا است۔"[1]

اسی طرح اس نے "تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات الاماکن" میں لکھا ہے:۔

وانما رصد المامون كان لما طالع من كتب اليونانيين حصة الجزء الواحد خمس مائة اسطاذيا وهو مقدارهم كانوا يقدرون بها المسافات ولم يجد عند المترجمين علما شافيا بمقدار ما يتعارف عليه حينئذ امر على ما حكى حبش عن خالد المروزي جماعة من علماء الصناعة وحذاق الصناع من النجارين والصفارين بعمل الآلات واختيار موضع بهذه المساحة فاختير موضع من برية سنجار من حدود الموصل يبعد عن قصبتها تسعة عشر

اور جب مامون الرشید نے یونانی حکما کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ (محیط زمین کے) ایک درجہ کی لمبائی ۵۰۰ اسطاذیا ہوتی ہے، اور یہ انکا پیمانہ تھا جس سے وہ فاصلے ناپا کرتے تھے، مگر مترجموں کے پاس اسکی لمبائی کے بارے میں کافی معلومات نہ تھیں، جو اس وقت اس پر روشنی ڈالتیں، اس لیے اس نے جیسا کہ حبش الحاسب نے خالد المروروزی سے روایت کی ہے، اس فن (ہیئت) کے ماہرین کی ایک جماعت اور ہوشیار کاریگروں جیسے بڑھئی، لوہار وغیرہ کو آلات رصد تیار کرنے، نیز اس پیمائش کے تجربہ کے لیے مناسب مقام کا انتخاب کرنے کا حکم دیا، چنانچہ مضافات موصل میں صحرائے سنجار

[1] کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم (فارسی) مرتبہ جلال ہمائی ص ۱۶۰ - ۱۶۴

فرسخا ومن سر من رای ثلثة واربعين فرسخا، فارتضوا استواها وحملوا الآلات اليها وعينوا منها موضعا رصدوا بها ارتفاع الشمس نصف النهار. ثم افترقوا منه فريقين فتوجه خالد مع طائفة من المساح والصناع الى جهة القطب الشمالي وتوجه علي بن عيسى الاصطرلابي واحمد بن البحتري الذراع مع جماعة نحو القطب الجنوبي ورصدت كل طائفة منها ارتفاع الشمس نصف النهار حتى وجدوه قد تغير جزءا واحدا سوى التغير الحادث من الميل. وكانوا يذرعون الطريق في ذهابهم وينصبون السهام على طريقهم، فلما عادوا اعتبروا المساحة ثانية واجتمعت الطائفتان حيث افترقتا

کے اندر ایک مقام منتخب کیا گیا جو موصل کے صدر مقام سے ۱۹ فرسخ اور سر من رای سے ۴۳ فرسخ دور تھا، انھوں نے اسکی ہمواری اور چورس پن کو پسند کیا، اور آلات رصدیہ وہاں لے گئے اور ایک مقام متعین کر کے نصف النہار کے وقت آفتاب کے ارتفاع کو ناپا، پھر وہاں سے وہ دو جماعتوں میں بٹ گئے، خالد المروروزی پیمائش کرنے والوں نیز کاریگروں کی ایک جماعت کے ساتھ قطب شمالی کی سمت میں اور علی بن عیسیٰ الاصطرلابی اور احمد البحتری گز دار دوسری جماعت کے ساتھ قطب جنوبی کی سمت میں چلے۔ دونوں جماعتوں نے آگے چل کر نصف النہار کے وقت آفتاب کے ارتفاع کو ناپا، یہاں تک کہ انھوں نے دیکھا کہ اس میں ایک درجہ کا فرق ہو گیا ہے، سوائے اس تغیر کے جو "میل شمسی" کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، وہ اپنے راستہ کو ناپتے جاتے تھے، اور تیر گاڑتے جاتے تھے، پھر جب لوٹے تو انھوں نے اپنی مساحت کی دوبارہ پیمائش کی اور

فوجد واحصة الجزء الواحد
من الارض ستة وخمسين ميلا

دونوں جماعتیں جہاں سے جدا ہوئی تھیں وہیں
پھر آملیں، پس انھوں نے محیط ارض کے ایک درجہ کی لمبائی

یہ مقدار اس سے مختلف ہے جو عام طور پر روایت کی گئی ہے (مزید تفصیل آگے آتی ہے) چنانچہ البیرونی نے الفرغانی سے وہی ۵۶ ⅔ میل کی روایت کی اور آگے چل کر کہتا ہے:۔

وحکی عن الفرغانی ثلثا میل تتبع
الامیال المذکورة

اور فرغانی سے مذکورہ (یعنی چھپن) میلوں کے ساتھ
"دو ثلث" (⅔) میل کو مزید نقل کیا گیا ہے۔

البیرونی کہتا ہے کہ عام طور پر یہی (۵۶ ⅔) والی مقدار نقل کی گئی ہے۔

وکذلك وجد الحکایات کلها مطبقة
علی هذین الثلثین

اور اس باب میں جتنی حکایات مجھے ملی ہیں ان سب کا
(۵۶ میلوں کے ساتھ) اس ⅔ میل پر اتفاق ہے یعنی سب

البیرونی نے "تحدید نہایات الاماکن" میں حبش کی طرف جو روایت منسوب کی ہے وہ اس کی تصنیف "کتاب الابعاد والاجرام" سے ماخوذ ہے جس کا اس نے حوالہ بھی دیا ہے، مگر حبش خود ان پیمایش کرنے والوں میں شریک نہ تھا، لیکن ابن یونس نے "زیج حاکمی" میں "الکلام فی ما بین الاماکن من الذراع" کے زیر عنوان ان پیمایش کرنے والوں میں سند بن علی کو بھی بتایا ہے اور اس سے روایت کی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

ذکر سند بن علی فی کلام وجدته له
ان المامون امره هو وخالد بن
عبد الملك المروروذی ان یقیسا
مقدار درجة من اعظم دائرة من

مجھے سند بن علی کی تصریحات ملیں جن میں اس نے لکھا ہے
کہ مامون الرشید نے اسے اور خالد بن عبد الملک مروروذی
کو دائرہ عظمی کے ایک درجہ کی لمبائی دریافت کرنے کا حکم دیا
سند کہتا ہے کہ ہم سب اس کام کے لیے روانہ ہوئے،

؎ تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن۔ اس کتاب کا واحد نسخہ البیرونی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتبخانہ فاتح (قسطنطنیہ) میں موجود ہے، زیر شمارہ ۳۳۸۶ Birunis اس کے متعلقہ حصہ کو [جس سے مذکورہ عبارت ماخوذ ہے] ذکی ولیدی توغان نے "صفة المعمورة علی البیرونی" یا "Picture of The World" کے زیر عنوان شائع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "Memoirs of The Archaeological Survey of India No 53

دوائر سطح کرة الارض، قال فسرنا
لذلك جمیعا وامر علی بن عیسی
الاصطرلابی وعلی بن البحتری
بمثل ذلك فسارا الی ناحیة اخری
قال سند بن علی فسرت انا وخالد بن
عبد الملك الی ما بین وامه (الرقة)
وتدمر وقسنا هنالك مقدار درجة
من اعظم دائرة تمر بسطح الارض
فکان سبعة وخمسین میلا وقاس
علی بن عیسی وعلی بن البحتری فوجدا
مثل ذلك وورد الکتابان من
الناحیتین فی ذلك فی وقت
واحد بقیاسین متفقین

مامون نے علی بن عیسی الاصطرلابی اور علی بن
البحتری کو بھی اسی کام پر مامور کیا، وہ دوسری
طرف روانہ ہوئے، سند بن علی نے لکھا ہے کہ میں
اور خالد بن عبد الملک رقہ اور تدمر کے درمیانی
علاقے میں چلے اور وہاں سطح زمین کے دائرہ اعظمی
کے ایک درجہ کی لمبائی کا حساب لگایا تو یہ ۵۷ میل
تھی اور علی بن عیسی اور علی بن البحتری نے بھی
دریافت کیا تو اتنا ہی پایا، اور دونوں طرف سے
دونوں جماعتوں کے (اطلاعی) خطوط
بیک وقت پہنچے، جن میں ایک ہی
حساب درج تھا۔

لیکن یہ مقدار [ستاون میل] عام روایتوں میں مروی مقدار سے بالکل ہی مختلف ہے، اسی طرح ابن یونس نے حبش سے جو مقدار روایت کی ہے وہ بھی سب روایتوں سے مختلف ہے، اس نے اس سے ایک درجہ کی لمبائی ۵۶ ¼ میل روایت کی ہے، چنانچہ وہ (ابن یونس) لکھتا ہے:۔

وذکر احمد بن عبد الله المعروف
بحبش فی الکتاب الذی ذکر فیه
ارصاد الممتحن بدمشق ان المامون

احمد بن عبد اللہ المعروف بحبش نے اپنی اس کتاب
میں جس کے اندر دمشق کی "ارصاد ممتحن" کا
ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ مامون نے سطح زمین کے

امر بان تقاس درجة من اعظم
دائرة من دوائر بسيط كرة الارض
قال فسار والذالك فی برية سنجار
حتی اختلف ارتفاع النهار بين
القياسين فی يوم واحد بدرجة
ثم قاسوا ما بين المكانين فكان
نو ميلاً وربع ميل وكل ميل منها
اربعة آلاف ذراع بالذراع السوداء
التی اتخذها المامون[1]

دوائر عظمی میں سے ایک دائرہ کے درجہ واحد
کی لمبائی معلوم کرنے کا حکم دیا، اسکے لیے ہیئت داں
صحرائے سنجار میں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ دونوں
مقاموں کے (جس مقام سے روانہ ہوئے تھے
اور جس مقام پر پہنچے تھے) ایک ہی دن کے
"ارتفاع نہار" میں ایک درجہ کا فرق پڑ گیا،
اس سے انھوں نے دونوں مقاموں کے درمیانی فاصلے
کو ناپ لیا جو ۵۶ ¼ میل تھا، ہر میل چار ہزار گز
(گز سوداء کے حساب سے جسے مامون نے رائج کیا تھا)

البیرونی کا محاکمہ

البیرونی لکھتا ہے کہ جس طرح حبش نے صرف ۵۶ میل کی روایت کی ہے، اسی طرح ابو حامد الصغانی نے ثابت بن قرہ سے بھی ۵۶ میل کی روایت کی ہے، مگر یہ روایت پیمایش کرنے والوں نے حبش سے نہیں بیان کی تھی، بلکہ جب ان میں سے ایک شخص (خالد بن عبد الملک المروزی) محیط ارضی کے درجۂ واحد کی لمبائی کی دریافت کی کیفیت قاضی یحیٰی بن اکثم کو لکھا رہا تھا تو حبش نے بھی سن لیا تھا۔ خالد نے خاص طور سے اسے اس سے روایت نہیں کی تھی، (لہذا یہ اتفاقیہ روایت خرقِ اجماع کا باعث نہیں ہو سکتی) یہ بھی گمان کیا جا سکتا ہے کہ

[1] زیج ابن یونس کا ایک نسخہ لیڈن میں اور دوسرا گورنمنٹ بٹاویا کے (Insa Tute Nabonal) کے اندر موجود ہے، ان دونوں نسخوں کی مدد سے Par Le Cem Caussin نے ۱۸۰۴ء میں پیرس سے اس کتاب کو شائع کیا، اسکے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں، ایک نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہے، دوسرا شاید کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں ہے، میں محترم المقام جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں کہ ان کی عنایت سے مجھے اس نسخے سے حسب دلخواہ استفادہ کا موقع ملا۔

"کتاب الابعاد والاجرام" میں حبش نے یہ واقعہ لکھا ہے، ۵۶ کے بعد ¼ لکھنے سے رہ گیا ہو، البیرونی کہتا ہے کہ اس کا احتمال نہیں ہے، کیونکہ حبش نے زمین سے متعلق تمام پیمائشوں کو اسی "۵۶" سے مستخرج کیا ہے، کیونکہ البیرونی نے جب ان مختلف ابعاد کا امتحان لیا تو ان کی اصل "۵۶" ہی آئی۔

اس لیے البیرونی کہتا ہے کہ یہ دو روایتیں ہیں [ایک صرف ۵۶ کی اور دوسری ۵۶ ¼ کی] جو غالباً دو مختلف جماعتوں سے مروی ہیں، بہر حال یہ حیرت و استعجاب کی بات ضرور ہے۔ اس لیے اسکی جانچ نئی پیمائش ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔[1]

لہذا البیرونی کی تحقیق پسند طبیعت خاموش نہ رہ سکی اور اس کے باوجود کہ نہ اس کے پاس ذرائع تھے اور نہ کسی ساتھی کی اعانت حاصل تھی، اس نے پہلے یہ تجربہ جرجان کے مضافات میں دہستان کے علاقہ میں کیا، مگر وہاں ناکام رہا، شاید قسام ازل نے بھی یہ شرف برصغیر پاک و ہند ہی کے نصیب میں مقدر کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۴۱۷ھ کے قریب اس نے یہاں یہ تجربہ کیا جس میں کامیابی ہوئی، اور اس نتیجہ پر پہنچا جس پر عہد مامونی کے ہیئت داں پہنچے تھے، چنانچہ کتاب التفہیم (عربی) ص ۱۱۹ میں لکھتا ہے:-

وقد اعتبرت انا ذلك بارض
الهند فلم يخالف شيئاً يعبأ به

میں نے ہندوستان میں اس کا تجربہ کیا تو
اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں نکلا،

[مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "آجکل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۳ء میں "سرزمین ہند پر محیط ارضی کی پہلی پیمائش" صفحہ ۲۷ - ۳۴]

[1] تحدید نہایات الاماکن

قاضی مبارک اور انکی شرح سلم

از جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی

"قاضی مبارک" ایک کتاب کا، اس کتاب کے مصنف کا اور مصنف کے خاندان کی کئی ممتاز شخصیتوں کا نام ہے، یہاں کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کچھ لکھنا مقصود ہے،

اتر پردیش کے ضلع ہردوئی میں ایک قصبہ گوپامئو ہے، جو ایک صدی قبل تک معقولات، منقولات اور تصوف وسلوک کا گہوارہ رہا ہے، اور دنیاوی وجاہت سے بھی اس مردم خیز خطے کے افراد کو وافر حصہ اپنے زمانے میں ملا، گوپامئوی خاندان کی ایک شاخ عرصے تک علاقہ مدراس میں واقع ریاست ارکاٹ کی نیم خودمختار والی اور وارث رہی ہے،

اس عنوان کے معنون قاضی مبارک سوم ہیں، جن کو شارح سلم کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے، اور جو درسگاہوں، قدیم کتب خانوں کی فہرستوں اور مشرقی علوم کے حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں،

قاضی مبارک اول گوپاموی جن کا تذکرہ بحر زخار (قلمی کتب خانہ عبدالباری اکیڈمی فرنگی محل)، سیر الاولیاء اور نزہۃ الخواطر میں موجود ہے، حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلوی کے مرید اور خلیفہ اور مشہور فارسی شاعر حضرت امیر خسروؒ کے پیر بھائی تھے، یہ قاضی صاحب اپنے پیر کے مزار پرانوار کے جوار میں مدفون ہیں،

در پایان روضۂ سلطان المشائخ مدفون گشت رحمۃ اللہ علیہ (بحر زخار)

اپنے پیر سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) کے مزار کے پائیں دفن ہوئے، اللہ ان پر رحم نازل فرمائے،

قاضی مبارک دوم قصبۂ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے مشہور بزرگ اور عہد اکبری کے ایک روحانی پیشوا بندگی نظام الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، ان کا ذکر بحر زخار، منتخب التواریخ (بدایونی) اور تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) وغیرہ میں ہے،

قاضی مبارک سوم شارح سلم بھی صوفی مشرب اور سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں شیخ محمد اکرم کے مرید بزرگ شاہ الہدیہ قلندر لاہرپوری کے خلیفہ تھے (بحر زخار) اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم، فقیہ، منطقی اور فلسفی گذرے ہیں، قاضی مبارک سوم کی مشہور تصنیف شرح سلم "قاضی مبارک" کے نام سے مشہور ہے، تو یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کتاب اپنے مصنف کے ہم نام ہوگئی، بات یہ ہے کہ سلم العلوم جو منطق کی ایک ادق اور مشکل ترین کتاب ہے، اور جس کے مصنف ملا محب اللہ بہاری (وفات ۱۱۱۹ھ) ہیں، جب سے لکھی گئی، اس وقت سے کسی معقولی عالم و فاضل کی لیاقت جانچنے کا یہی معیار بن گیا کہ وہ سلم العلوم کے اسرار و رموز کا کتنا زیادہ واقف کار ہے، بہت سے لائق اور ذہین علما نے سلم العلوم کی شرحیں لکھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوانے کی کوشش کی، اور سلم العلوم کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، ان شرحوں میں باہم امتیاز قائم کرنے کی غالباً یہی آسان صورت سمجھی گئی کہ مصنفین کے نام ہی سے ان کو یاد کیا جائے، تو جو شرحیں درسگاہوں اور علمی حلقوں میں مقبول ہوگئیں وہ اپنے مصنف کے نام ہی سے موسوم ہوگئیں، جیسے ملا حسن، قاضی مبارک، حمد اللہ وغیرہ، دوسری شرحیں مصنفین کی اضافت سے شرح کہلائیں، جیسے شرح سلم ملا عبدالحق، شرح سلم ملا مبین وغیرہ۔

قاضی مبارک گوپاموی کی شرح "قاضی مبارک" منطق کی انتہائی اور آخری کتاب سمجھی جاتی ہے، اور جو مدرس اس کے مطالب تشفی بخش طریقے سے طلبا کو سمجھا دیتا اس کا لوہا سب مان لیتے تھے،

مصنفات او شرح سلم کہ اشتہار از مشرق تا مغرب دارد، حاشیہ میر زاہد و شرح

قاضی مبارک کی تصانیف میں شرح سلم جو مشرق سے لیکر مغرب تک مشہور ہے اور

مواقف و حاشیہ میرزاہد ملا جلال و دیگرے
رسائل بسیار از آنحضرت یادگار ماندہ
(بحر زخار)

حاشیہ میرزاہد شرح مواقف و حاشیہ میرزاہد
ملا جلال اور دوسرے بہت سے رسائل بطور
یادگار موجود ہیں،

مولانا فضل امام خیرآبادی (وفات ۱۲۴۳ھ) نے اپنی کتاب "آمد نامہ"[1] میں نئی بات یہ لکھی ہے:۔

اول کسیکہ حاشیہ بر میرزاہد نوشت و
سلم را شرح کرد او بود

قاضی مبارک پہلے شخص ہیں جنھوں نے
"میرزاہد" پر حاشیہ لکھا اور سلم کی شرح لکھی،

مولانا فضل امام کے اس دعوے نے کہ سلم العلوم کی سب سے پہلی شرح قاضی مبارک گوپاموی نے لکھی تھی، تحقیق کے لیے ایک نیا باب کھول دیا ہے،

---

[1] "آمد نامہ" مولفہ مولانا فضل امام خیرآبادی کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ وہی مروج آمد نامہ ہے جو فارسی نصاب کا بالکل ابتدائی رسالہ ہے، جو 'صفۃ المصادر' کے نام سے بھی موسوم ہے، ہمارے عہد کے مشہور مصنف اور محقق علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی غالباً یہی اشتباہ ہوا، انھوں نے "حیات شبلی" میں مولانا فضل امام خیرآبادی کے ذکر میں لکھ دیا "بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمد نامہ" ان ہی کی آمد طبع کا نتیجہ ہے" (ص ۲۲) بچوں کا ابتدائی فارسی رسالہ آمد نامہ یا صفۃ المصادر، دراصل مصطفیٰ خاں ولد حاجی روشن خاں مالک مطبع مصطفائی (کانپور) کی آمد طبع کا نتیجہ ہے، مولانا فضل امام کا آمد نامہ دوسری چیز ہے، یہ ابتک کہیں طبع نہیں ہوا ہے، اور مصنف کے قلم کا لکھا ہوا لاہرپور (ضلع سیتاپور) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، یہ آمد نامہ، فارسی کے صرف و نحو، معانی و بیان اور بدیع کے قواعد پر مشتمل ہے، اور اس کا آخری باب (پانچواں باب) چند نامور علماء کے حالات پر مشتمل ہے، یہ پانچواں باب "تراجم الفضلاء" کے نام سے انگریزی ترجمے اور انگریزی حواشی کے ساتھ کراچی میں ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے۔

تحقیق کرنے والے کو سب سے پہلے سابقہ ایک ایسی روایت سے پڑتا ہے جس کی حیثیت افواہ سے زیادہ نہیں ہے، احوال علمائے فرنگی محل (مصنفہ مولانا الطاف الرحمٰن قدوائی تلمیذ حضرت مولانا عبد الباریؒ فرنگی محلی) میں ہے:۔

"آپ کی (ملا احمد عبد الحق فرنگی محلی کی) شرح سلّم قاضی مبارک کے پہلے ہے، کیونکہ جب ملا محب اللہ بہاری نے سلّم و مسلّم دونوں متن لکھ کر ملا نظام الدین صاحب کی خدمت میں بھیجے تو ملا صاحب نے فرمایا کہ ملا بہاری نے میرا امتحان لیا ہے، یہ فرما کر ایک متن 'مسلم' خود لے لیا اور ایک ملا عبد الحق قدس سرہٗ کو دیا، دونوں صاحبوں نے شرحیں لکھیں اور ملا بہاری کے پاس بھیجا انھوں نے دیکھ کر بہت تعریف کی اور کہا کہ الحمد للہ میرے استاد زادے اب استاد ہو گئے"۔ (ص ۱۲)

اسی مفہوم کی ایک عربی تحریر جدی و استاذی مولانا محمد عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی (وفات ۱۹۴۱ء) کے قلم کی لکھی ہوئی، ملا احمد عبد الحق کی شرح سلم کے مطبوعہ نسخے کے شروع میں نظر سے گزری، اس عربی عبارت کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"سلم العلوم کے مصنف ملا محب اللہ بہاریؒ نے جب سلّم اور مسلّم تصنیف کیں تو ان دونوں کتابوں کو ملا نظام الملۃ والدینؒ (فرنگی محلی) کے پاس بھیجا، اور خواہش کی کہ وہ ان کی شرحیں تحریر کریں، مسلم کی شرح تو خود ملا نظام الدینؒ نے لکھی اور سلم ان کو (اپنے شاگرد اور حقیقی بھتیجے مولانا احمد عبد الحق کو) دیدیں، پس انھوں نے کیا خوب اس کی شرح کی، ملا صاحب (ملا نظام الدینؒ) نے یہ دونوں شرحیں ملا محب اللہ بہاری کو بھیجیں تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور ان کا انتقال سنہ (کذا) میں ہوا، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ میں نے اپنے کسی استاد سے سنا ہے، جن کا نام حافظے میں نہیں رہا۔"

مولانا عنایت اللہ مرحوم کی یہ تحریر زمانۂ طالب علمی کی معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کو خود اس روایت پر بھروسہ نہیں رہا تھا، اسی لیے انھوں نے اپنی تصنیف "تذکرہ علمائے فرنگی محل"

میں مولانا احمد عبدالحق کے حالات میں اس کا ذکر نہیں کیا،

بہرحال یہ روایت درایتاً بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور دوسری تصریحات کے اعتبار سے بھی غلط اور فرضی ہے۔ سلم اور مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری حسب تصریح میر غلام علی آزاد بلگرامی (مآثر الکرام) و مولانا فضل امام خیرآبادی (آمدنامہ) بانی درس نظامیہ استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بھی شاگرد تھے، اور ملا قطب الدین شہید کے ایک نامور شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی کے بھی شاگرد تھے، اسی شاگردی کی نسبت نے اس روایت کو شہرت دی ہوگی کہ ملا محب اللہ بہاری نے اپنی تصانیف اپنے استاد زادے ملا نظام الدین کی خدمت میں بھیجیں اور شرح لکھنے کی فرمائش کی۔

لیکن ملا بہاری کی زندگی میں ملا احمد عبدالحق فرنگی محلی کا سلم کی شرح لکھ دینا ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے، جب ملا بہاری کا انتقال ہوا (۱۱۱۹ھ) تو اس وقت ملا احمد عبدالحق کی عمر صرف ۱۹ سال تھی (پیدائش ۱۱۰۰ھ) اگر اس وقت وہ فارغ التحصیل بھی ہو چکے ہوں تب بھی ایسی مشکل کتاب کی ایسی شرح لکھنے کے لیے جو مدت درکار ہونا چاہیے وہ ان کو ملا بہاری کی زندگی میں نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

اور پھر اس صراحت کے بعد جو خود ملا احمد عبدالحق نے شرح سلم میں کر دی ہے، ایسی تمام روایتوں اور افواہوں کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے، ملا عبدالحق اپنی شرح سلم (تصدیقات) کے خاتمے پر لکھتے ہیں:-

صنفه خادم الطلبة احمد عبدالحق	طلباء کے خادم عبدالحق نے جو فاضل کامل
بن الفاضل الکامل محمد سعید بن ملا قطب الدین	محمد سعید بن قطب العلماء العرفاء ملا قطب الدین
الشهید قطب العلماء العرفاء	شہید انصاری سہالوی کا بیٹا ہے،

الانصاری السهالی (کذا)	اس شرح کو ۱۱۳۶ھ میں
سنة الف ومائة وستة وثلثين من	تصنیف کیا

ملا محب اللہ بہاری کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہو چکی تھی، اس کے پندرہ سال بعد ملا عبدالحق کی شرح تصنیف ہوئی، اس لیے ملا بہاری کی شرح دیکھنے اور اس پر خوش ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں رہا،

اس تصریح نے جہاں یہ واضح کر دیا کہ ملا احمد عبدالحق کی شرح سلم ملا بہاری کی زندگی میں تصنیف نہیں ہوئی تھی، وہاں یہ بھی واضح کر دیا کہ قاضی مبارک کی شرح سلم سے پہلے ملا احمد عبدالحق کی شرح تصنیف ہو چکی تھی، اس لیے کہ قاضی مبارک گوپاموی نے اپنی شرح سلم کے خاتمے پر جو تاریخ تصنیف خود بیان کی ہے وہ کئی سال متاخر ہے:

قد تم الشرح بفضل من الله	اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و
تعالی وتبارك من عبده	احسان سے اس کے بندے محمد مبارک
محمد مبارك فی سنة الف	کے ہاتھوں یہ شرح، ربیع الاول
ومائة اربعين وثلث من	پنجشنبہ ۱۱۴۳ھ میں شہر دہلی میں
الهجرة النبوية فی سابع	پایۂ تکمیل کو پہنچی،
شهر ربیع الاول یوم الخمیس	
فی بلدة شاه جهان آباد	

۱۱۳۶ھ اور ۱۱۴۳ھ کے درمیان پورے چھ سال کا فرق ہے، اور قاضی مبارک کی شرح سے ملا احمد عبدالحق کی شرح چھ سال مقدم ہے۔ ایسی صریح شہادتوں کے باوجود، جو شرحوں کی تصنیف کے وقت سے موجود ہیں۔ ایسی بے بنیاد باتیں اگر مشہور ہو گئیں تو ان کو

محض خوش اعتقادی سمجھنا چاہیے۔

یہاں ایک پیچیدگی باقی رہ جاتی ہے، ملا احمد عبد الحق کی شرح اگرچہ مقدم ہے، جیسا کہ دونوں شارحوں کی تصریح سے ظاہر ہو چکا ہے، لیکن ملا کی شرح میں قاضی کی شرح کے بعض مطالب کی تردید بھی موجود ہے، یہاں سوائے قیاس کی مدد لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا، یہی ہوا ہوگا کہ ملا نے تردیدی مطالب کا اضافہ بعد میں قاضی کی شرح نظر سے گذرنے کے بعد کیا ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ ملا احمد عبد الحق اور قاضی مبارک دونوں نے شرحیں لکھنا شروع کی ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ شرحیں دو چار مہینے کیا دو چار برس میں بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھیں، اس سے دوگنی بلکہ تگنی مدت ایسی اہم تصنیف کے لیے درکار ہونا چاہیے، اور یہ دونوں بزرگ صاحب درس بھی تھے، تو شرحوں کی تکمیل سے پہلے ہی طلبا، اور شاگردوں کے ذریعہ شرحوں کے مطالب گویا منو اور فرنگی محل کے درمیان منتقل ہوتے رہے ہوں، اس زمانے میں جب چھاپے خانے نہیں تھے، ایسا ہوا ہی کرتا تھا کہ مصنف نے تصنیف شروع کی اور شاگردوں نے اس کے اجزا نقل کر دینا شروع کر دیے قبل اس کے کہ تصنیف تمام ہو علمی حلقوں میں تصنیف پہنچ چکی ہوتی تھی، اس کی ایک مثال علامہ صدر الشریعۃ شارح وقایہ نے جو آٹھویں صدی ہجری کے بڑے مصنف گزرے ہیں خود بیان کر دی ہے، شرح وقایہ کے مقدمے میں ہے:

حتی اتفق اتمام تالیفہ مع	وقایہ کی تالیف ادھر تمام ہوئی جس کے ساتھ میرا اسے
اتمام حفظی وانتشر بعض النسخ	حفظ کرتے جانا بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا، ادھر اس کے
فی الاطراف	بعض نسخے اطراف وجوانب میں پھیل گئے۔

غیرہ قاضی کی شرح پر ملا احمد عبد الحق کی شرح کا تقدم ثابت اور متحقق ہو گیا، اور مولانا فضل امام خیرآبادی کا قاضی مبارک کے بارے میں یہ دعویٰ کہ "اول کسیکہ ..... سلم را شرح کردہ او بود" محض دعویٰ ہی رہا،

پھر بھی ابھی یہ بات تشنۂ تحقیق ہے کہ کیا ملا احمد عبد الحق ہی سلم العلوم کے پہلے شارح ہیں یا ان پر بھی کسی کو شرف تقدم حاصل ہے؟

یہ بات بھی ملا کی شرح کے خاتمے کی ایک عبارت سے واضح ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

وقد کنت بالغانی الایضاح لم نجد	میں نے مطالب کی وضاحت میں کوشش بلیغ کی ہے
مثلہ شرحا موضحاً فائقاً للاذکیاً	ایسی واضح اور خیالات سے ممتاز اور طلبہ کے لیے
نافعاً للطلاب	مفید کوئی دوسری شرح ہم نے نہیں پائی۔

گویا ملا احمد عبد الحق کی شرح سے پہلے بھی کچھ شرحیں لکھی جا چکی تھیں، جو بہت واضح اور طلبا کیلئے زیادہ مفید نہیں تھیں، اس شرح سے پہلے دوسری شرحوں کے وجود کا علم ملا صاحب ہی کی ایک دوسری تحریر سے پوری صراحت کے ساتھ ہو جاتا ہے، وہ سلم العلوم کی نازک خیالیوں اور باریک بینیوں کی تعریف کرنے کے بعد اپنی شرح (تصورات) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"سلم العلوم کے طلباء کے لیے کتاب کے مشکلات کا بغیر امداد کے سمجھنا ممکن نہ تھا، اگرچہ اس کتاب کی شرحیں لکھی گئی تھیں، جن میں بعض غیر ضروری طور پر طویل تھیں، اور بعض کتاب کے مطالب سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں (یعنی غلط شرحیں تھیں)، نہ ان سے کتاب کے نکات کھلتے تھے اور نہ مبتدی طلباء کے لیے ان میں کوئی نفع تھا، تو مجھے خیال ہوا کہ سلم کی ایک مفصل، واضح اور مطالب سے پردہ اٹھا دینے والی شرح کروں تو پہلے میں نے سلم کے مبحث تصدیقات کی شرح کی، اس کے بعد مبحث تصورات کی بدرجۂ اتم و اکمل شرح لکھی"۔ (عربی عبارت کا حاصل اپنے الفاظ میں)

بہرحال جب ملا احمد عبد الحق کی شرح جو ۱۱۳۶ھ میں (مبحث تصدیقات تک) پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی، اولین شرح ثابت نہیں ہو پاتی تو قاضی مبارک کی شرح سلم یعنی "قاضی مبارک" جو ۱۱۴۳ھ میں مکمل ہوئی، اولین شرح کیسے ہو سکتی ہے۔

قاضی مبارک شارح سلم کے بارے میں مشہور اور بعض متاخر کتابوں میں مرقوم ہے کہ وہ میرزاہد ہروی کی

کے شاگرد تھے، میرزاہد کی شاگردی ایک ماہر علوم عقلیہ کے لیے یقیناً مایۂ افتخار ہے، لیکن شاگردی کی اس شہرت کو تسلیم کرنا بہت دشوار ہے، جب تک معاصر تذکروں میں اس کی صراحت نہ مل جائے، ظاہری قرائن اس کے بالکل خلاف جاتے ہیں،

خاندان گوپامئو کے ایک صاحب تصنیف اور واقف انساب بزرگ حکیم محمد بہاء الدین مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ مہینے پہلے ایک استفسار کے جواب میں تحریر کیا تھا، یہ (قاضی مبارک) اپنے خاندانی بزرگ ملا قطب الدین الشہیر بہ ملا قطب اول کے شاگرد تھے، اور صحیحین حضرت حاجی صفۃ اللہ خیرآبادی سے پڑھیں، میرزاہد ہروی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا ... ۱۱۶۲ھ میں وفات پائی۔

حکیم صاحب مرحوم نے بھی میرزاہد سے تلمذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور محض سرسری اس کا ذکر کیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی شہرت کو قابل اعتماد قرار دے کر یہ تحریر کر دیا۔

پہلی بات یہ دیکھنے والی ہے کہ میرزاہد کا سنہ وفات ۱۱۰۱ھ اور قاضی مبارک کا ۱۱۶۲ھ اگر قاضی صاحب نے میر صاحب سے پڑھا ہے اور رسماً نہیں بلکہ پڑھنے کے لائق پڑھا، اور میر صاحب کی بالکل آخری عمر میں پڑھا تو قاضی صاحب کی عمر ۱۱۰۱ھ میں تخمیناً ۱۵ - ۱۶ سال ہونا چاہئے اور قاضی صاحب کی عمر وفات کے وقت لگ بھگ اسّی سال ہوگی، یہ طویل عمری اگر ہوتی تو تذکروں میں اس کی صراحت بھی ہوتی،

اور جب اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ میرزاہد کی آخری عمر کابل میں بسر ہوئی تو قاضی مبارک کے بارے میں یہ بھی صراحت ملنا چاہیے کہ وہ بغرض حصول تعلیم کابل تک گئے تھے،

میرزاہد کے بارے میں لکھا ہے:-

فلما تولی السلطان عالمگیر بقی	(شاہ جہاں کے بعد) جب عالمگیر بادشاہ ہوا
ایضاً علی تلک الخدمة بایام کثیرة	تو میرزاہد اسی خدمت (کابل کی وقائع نگاری)

ثم ارتحل الی معسکرہ فولاہ	پر بہت دنوں تک مامور رہے پھر وہ
احتساب عسکرہ سنة ۱۰۷۷	عالمگیر کی چھاؤنی میں واپس آئے تو بادشاہ
ثم سلمہ السلطان صدارة	نے انھیں چھاؤنی کا محتسب مقرر کر دیا.
کابل فاعاد الیها واشتغل	یہ ۱۰۷۷ھ کی بات ہے، پھر بادشاہ نے کابل
بالدرس حتی صار استاذ	کی صدارت ان کے سپرد کر دی اور وہ اپنے
الکل	پرانے عہدے پر لوٹ آئے اور (کابل پہنچ کر)
(منقول از تقریظ نوشتۂ مولوی محمد سعد اللہ	درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، یہاں تک
بر رسالۂ قطبیہ مطبوعۂ قدیم)	کہ حکمت استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی تحریر ہے:-

وقد سلط علیه فی آخر عمرہ	میرزاہد ہروی آخری عمر میں انتہائی پرہیزگار
غایة التورع والاحتیاط فاستعفی	اور محتاط ہو گئے تھے انھوں نے تمام عہدوں
عن کل المناصب واشتغل بعبادة	سے استعفا دیدیا تھا، اور معبود حقیقی کی عبادت
المعبود الحق وتاب سائر المعائب	میں تمام لغویات سے تائب ہو کر مشغولیت
حتی لقی اللہ عزوجل سنة ۱۱۰۱	اختیار کر لی تھی، یہاں تک کہ ۱۱۰۱ھ میں
	وہ لقاے خداوند تعالیٰ سے فائز ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ قاضی مبارک نے اگر ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا تو اولاً یہ کہ وہ کابل گئے ہوں گے، ثانیاً یہ کہ کابل جانے کے وقت ان کی اتنی عمر ضرور ہوگی کہ وہ ہردوئی، یا دلی و شاہجہان آباد سے بغرض حصول تعلیم جا سکتے ہوں، اور ثالثاً یہ کہ میرزاہد کے انتقال سے چند سال قبل وہاں پہنچے ہوں گے اور ان سے پڑھا ہوگا، کیونکہ آخری عمر میں میرزاہد صرف معبود حقیقی کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے،

ان سب چیزوں کو حساب میں رکھا جائے تو ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میرزاہد کے انتقال کے وقت (۱۱۰۱ھ) قاضی مبارک کی عمر بیس سال سے متجاوز ہوگی اور قاضی مبارک کا جب ۱۱۶۲ھ میں انتقال ہوا تو وہ اسّی سال سے بھی متجاوز ہو چکے تھے،

عقلاً اس اندازے میں کوئی سقم نہیں ہے، لیکن تذکرہ نویسوں کی عادت کے پیش نظر یہ وہ امور ہیں جن کی صراحت تذکروں میں ضرور ہونا چاہئے،

اگر قاضی مبارک کا سال پیدائش معلوم ہو جاتا تو قصہ طے تھا، اور کسی قیاس آرائی کی ضرورت باقی نہ رہتی، افسوس ہے کہ اس جستجو میں ابتک کامیابی نہیں حاصل ہو سکی،

قاضی مبارک کے سنہ پیدائش کی صراحت تو نہیں، ایک اشارہ ضرور ملتا ہے۔

پرگنہ گوپامئو کے منصب قضا کے بارے میں قاضی مبارک کے نام مغل بادشاہ کا جو فرمان صادر ہوا تھا، اس میں "کام کی حد تخمیناً ۴۷ سالہ" مرقوم ہے، یہ فرمان عہد محمد شاہ میں معتمد الملک میر جملہ معظم خاں خانجہاں بہادر مظفر جنگ وزیر اعظم و ظہیر الدولہ اعظم خاں بہادر مجاہد جنگ صدر الصدور کی مہروں کے ساتھ ۱۷ ربیع الاول سنہ ۹ جلوس محمد شاہ بادشاہ کو صادر ہوا تھا جس کو ہجری سال سے مطابق کرنے سے ۱۱۳۹ھ نکلتے ہیں،

اگر ۱۱۳۹ھ میں قاضی صاحب کی عمر تخمیناً ۴۷ سال تھی تو ان کی پیدائش تخمیناً ۱۰۹۲ھ میں ہوئی، اور جب میرزاہد ہروی کا ۱۱۰۱ھ میں انتقال ہوا تو قاضی مبارک کی عمر تخمیناً ۹-۱۰ سال تھی، دس سال کی عمر میں قاضی مبارک کا کابل جا کر میرزاہد سے پڑھنا مستبعد اور سراسر خلاف قیاس ہے؛ قاضی مبارک کی شاگردی کے بارے میں جو صراحتیں قدیم تذکروں میں ملتی ہیں ان میں کہیں میرزاہد سے شرف تلمذ کا ذکر نہیں ہے،

"آمدنامہ" (مولفہ مولانا فضل امام خیرآبادی متوفی ۱۲۴۳ھ) میں ہے:-

"قاضی مبارک شاگرد ملا قطب گوپاموی ست و بعضے کتب از شاہ حاجی صفۃ اللہ خیرآبادی اخذ کردہ"

رسالۂ قطبیہ (مولفہ مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی متوفی ۱۲۰۷ھ) میں استاد قاضی مبارک یعنی ملا قطب گوپاموی کو اپنے والد قاضی شہاب گوپاموی کا شاگرد لکھا ہے، اور قاضی شہاب گوپاموی کو ملا قطب الدین شہید سہالوی کا شاگرد لکھا ہے۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ) کے تلامذہ کے ذکر میں صاحب رسالۂ قطبیہ نے قاضی شہاب گوپاموی کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"عالم مدرس با عمل بودند اعلیٰ شاگردان شان ملا قطب خلفش و ملا محمد صالح کہ در بنگالہ بودند نیز شاگرد میرزاہد بودند و قطب مسطور تصانیف میرزاہد از ملا مذکور سند کردہ اند چنانچہ ملا داج الدین ولد قطب مسطور فخر این معنی می کردند"

یعنی قاضی شہاب گوپاموی (شاگرد ملا قطب الدین شہید سہالوی) کے خاص شاگرد ان کے بیٹے ملا قطب گوپاموی اور ملا محمد صالح تھے، ملا محمد صالح بنگال میں رہتے تھے اور میرزاہد کے شاگرد بھی تھے، ملا صالح سے ان کے استاد کے بیٹے اور ہم استاد ملا قطب نے میرزاہد کی تصانیف کی سند اور اجازت بھی حاصل کر لی تھی، چنانچہ ملا قطب گوپاموی کے بیٹے ملا داج الدین اپنے باپ کو اس سند اور اجازت حاصل ہونے پر فخر کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی مبارک ہی نہیں بلکہ ان کے استاد ملا قطب الدین گوپاموی نے بھی میرزاہد سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا بلکہ قاضی صاحب کے استاد نے میرزاہد کے ایک شاگرد ملا محمد صالح سے میرزاہد کی تصانیف کی اجازت (جو رسماً ایک کارروائی ہوتی ہے) حاصل کی۔

رسالۂ قطبیہ کی ایک عبارت جو قاضی مبارک کے بارے میں ہے، بڑی مشتبہ ہے متعدد قلمی نسخے

دیکھنے سے بھی یہ اشتباہ رفع نہیں ہوا، تمام نسخوں کی عبارت یکساں ہے اور وہ یہ ہے:-

"و قاضی مبارک شارح سلم و زاد پر ثلثہ و ملا اشرف شارح سلم اعلیٰ شاگردانش لکنہا محمد صالح اند"

"اعلیٰ شاگردانش" میں ضمیر کا مرجع نہیں کھلتا، اگر مطلب یہ ہو کہ ملا محمد صالح اعلیٰ شاگرد ہیں قاضی مبارک کے یا ملا اشرف شارح سلم کے تو یہ رسالہ قطبیہ کی اس سے اوپر والی عبارت کے خلاف پڑا ہے، جس میں ملا محمد صالح کو قاضی شہاب گوپاموی کا اعلیٰ شاگرد لکھا گیا ہے، اس کے علاوہ قاضی مبارک کے استاد ملا قطب گوپاموی کے بارے میں ہے کہ انھوں نے میرزاہد کی تصانیف کی اجازت ملا محمد صالح سے حاصل کی تو کیسے ہو سکتا ہے کہ استاد تو ملا صالح سے اجازت لے اور اس کا شاگرد ملا صالح کو پڑھائے، جب کہ ملا صالح میرزاہد سے بھی پڑھ چکے ہیں۔

اگر یہ کتابت کی غلطی ہے (اور یہ کتابت کی غلطی ہی ہو سکتی ہے) تو اصل عبارت "اعلیٰ شاگردان ملا صالح اند" ہے، یعنی قاضی مبارک اور ملا اشرف، ملا محمد صالح کے خاص شاگرد ہیں، یہ قرین قیاس بھی ہے کہ قاضی مبارک نے ملا قطب الدین گوپاموی سے بھی پڑھا اور ان کے استاد بھائی ملا محمد صالح سے بھی پڑھا، اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قاضی مبارک کو میرزاہد ہروی کا شاگرد جو کہا جاتا ہے تو کیسے کہا جاتا ہے، قاضی مبارک نے جب ملا محمد صالح سے پڑھا اور ان کے خاص شاگرد ہوئے تو بیک واسطہ میرزاہد کے بھی شاگرد ہوئے، کیونکہ قاضی صاحب کے استاد ملا صالح براہ راست میرزاہد کے شاگرد تھے۔

خود قاضی مبارک نے شرح سلم میں جو "قاضی مبارک" کے نام سے مشہور ہے، ہنہیات میں جا بجا میرزاہد ہروی کو "قال الاستاذ" کہکر یاد کیا ہے، ظاہر ہے کہ استاد کا استاد "الاستاذ" نہیں ہے، اگر قاضی صاحب "قال استاذی" کہتے تو بلاشبہ ان کو میرزاہد کا شاگرد ماننا پڑتا، چاہے قرائن ظاہری اس کے کتنے ہی خلاف ہوتے۔

ابوحیان توحیدی

از جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی

(۳)

ابوحیان توحیدی کی تصنیفات

ابوحیان توحیدی کی اکثر کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں، اب چند ہی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنی اکثر کتابیں خود جلوا دی تھیں، گو امام سیوطی اور طاش کبری زادہ اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں، ان کا بیان ہے کہ ابوحیان توحیدی کی تصنیفات نے اس کی زندگی ہی میں قبول عام حاصل کر لیا تھا، جلائے جانے کا ان پر اثر نہیں پڑا،[1]

بہرحال ابوحیان توحیدی کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کا پتہ چل سکا ہے:-

ادبی تصنیفات

(۱) **الامتاع والموانسہ** - یہ کتاب تین جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے، ڈاکٹر احمد امین اور احمد الزین نے اس پر گرانقدر حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا ہے، الامتاع ابوحیان توحیدی کی وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے، جس پر وہ فخر کر سکتا ہے، اس میں اس نے بے نظیر استحضار اور محیر العقول حافظہ کا مظاہرہ کیا ہے، یہ اس کے علمی و ادبی محاضرات کا مجموعہ ہے، جس میں اس نے ان سوالات کے جوابات دیے ہیں جو ابن عارض کی جانب سے کئے گئے تھے، الامتاع الف لیلہ کے طرز کی ایک کتاب ہے، فرق یہ ہے کہ الف لیلہ ایک ہزار راتوں پر مشتمل ہے اور الامتاع صرف چالیس

[1] بغیۃ الوعاۃ ص ۳۴۸ و مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۸۸

راتوں پر، الف لیلہ میں زیادہ تر واقعات افسانوی اور تخیلی ہیں، اس کے برعکس الامتاع کے مباحث عقلی اور واقعاتی ہیں، یہ تمام مباحث ابن عارض کے پیش کردہ ہیں، اور ابوحیان توحیدی نے فی البدیہہ ان کے جوابات دیے ہیں جو انتہائی عالمانہ اور بڑے سنجیدہ ہیں، جس سے ابن عارض کے تبحر اور ابوحیان توحیدی کی عبقریت دونوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے، عام طور پر گفتگو کا آغاز ابن عارض کی جانب سے ہے، گفتگو کے خاتمہ پر وہ ابوحیان سے یہ فرمائش کرتا ہے کہ وہ اس بحث کے حسب حال کوئی دلچسپ شعر یا پھڑکتا ہوا فقرہ کہے، ابوحیان توحیدی ان مسامرات کو روزانہ قلمبند کرکے اس کی نقل ابوالوفاء کو بھیجدیتا تھا[1]،

الامتاع میں جو مباحث ہیں وہ زیادہ تر بغداد سے تعلق رکھتے ہیں اور ابوحیان ان کا عینی شاہد ہے، اس لیے ان کے بارہ میں اس کی رائے زیادہ وقیع ہے، ان مباحث کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ابوحیان نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے، اس لیے اس نے اپنے دوست ابوالوفاء سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس میں رازداری سے کام لیگا،

الامتاع کے ذریعہ عہد بویہی کی ثقافت اس زمانہ کی عقلی اور علمی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے، اس کتاب میں دو ایسے واقعات بھی ہیں جو ادب اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں نہیں نظر آتے، اس سے اس کتاب کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے،

(۱) ایک اس مناظرہ کی دلچسپ روداد جو وزیر اعظم ابن فرات کے حضور میں یونانی منطق اور عربی نحو کے بارے میں متی بن یونس اور ابوسعید سیرانی کے درمیان ہوا تھا[2]،

(۲) دوسرے اخوان الصفا کے بارے میں بعض اہم انکشافات، چنانچہ بعد کے مورخ اخوان الصفا کے حالات کے بارے میں ابوحیان ہی کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں

---

[1] الامتاع ج ۳ ص ۲۰۶ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن عارض کون تھا؟ جس نے الامتاع کا مواد فراہم کیا، ابوحیان کا بیان ہے کہ ابن عارض وزیر کے عہدہ پر فائز تھا، عارض کی تعریف امام سمعانی نے کتاب الانساب میں یہ کی ہے: "من یعرف العسکر ویحفظ ارزاقهم ویوصلها الیهم ویعرضهم علی الملك اذا احتیج الی ذالك[1]" اس لیے اردو میں ہم اس عہدہ کو بخشی کے عہدہ سے تعبیر کرسکتے ہیں، عام طور پر ابن عارض اور ابن سعدان دو علیحدہ شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں، جو صحیح نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابن سعدان ہی کا دوسرا نام ابن عارض ہے، اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دلائل ہیں:-

۱- ابوعبداللہ حسین بن احمد بن سعدان نے ۳۷۳ھ لغایتہ ۳۷۵ھ صمصام الدولہ کی وزارت کے عہدہ پر رہا، ممکن ہے بخشی گیری کے عہدہ پر وزارت سے پہلے رہا ہو، یا یہ عہدہ اس کے خاندان میں موروثی چلا آرہا ہو۔

۲- ابوحیان توحیدی ۳۷۰ھ میں رے سے واپس آیا ہے، اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ابوالوفاء سے ہوتی ہے، ابوالوفاء اس سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اسے ابوعبداللہ العارض وزیر اعظم کے یہاں باریاب کرادے گا، اور ۳۷۰ھ سے ۳۷۵ھ تک ابن سعدان ہی وہ شخص ہے جو وزارت عظمی کے عہدہ پر تھا، اور جس کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔

۳- ابوحیان توحیدی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس نے بغداد کے پل پر وزیر ابن بقیہ کو[2]

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی (لندن اڈیشن) [2] ابن بقیہ عضد الدولہ کا وزیر تھا، عضد الدولہ نے کسی جرم پر اسے سولی دیدی تھی، مشہور شاعر ابوالحسن انباری نے ابن بقیہ کا مرثیہ لکھا ہے، جو عربی کے بے مثل مرثیوں میں ہے، مرثیہ کا مطلع یہ ہے

علو فی الحیاۃ وفی الممات — لحق انت احدی المعجزات

(باقی حاشیہ ص ۲۰۹ پر)

کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا، وہ یہ عبرت ناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "سبحان اللہ، قاتل (عضد الدولہ) زیر زمین اور مقتول (ابن بقیہ، زیر آسمان"؟ ابوحیان نے وزیر اعظم ابوعبد اللہ سے جب یہ واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا، میں نے جہاں پناہ سے ابن بقیہ کی تدفین کی اجازت حاصل کر لی ہے، (الامتاع ج اول ص ۴۲)

یہ مسلم ہے کہ ابن بقیہ کو عضد الدولہ نے سولی دیدی تھی، اور اس پر بھی مورخین کا اتفاق ہے کہ ابن بقیہ کی لاش عضد الدولہ کے جانشین صمصام الدولہ کے عہد میں سولی سے اتاری گئی، اس وقت وزارت کے عہدہ پر ابن سعدان ہی تھا جس کی کنیت بھی ابوعبد اللہ تھی، اس لیے ابن سعدان کے سوا کوئی دوسری شخصیت نہیں ہو سکتی جس کی کنیت بھی ابوعبد اللہ ہو اور جو وزیر بھی ہو۔

۴۔ ابوحیان توحیدی نے اپنی دوسری مشہور کتاب الصدیق والصداقہ بھی ابن سعدان ہی کی فرمائش پر لکھی تھی، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن سعدان اور ابن عارض ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، الصدیق والصداقہ کے شروع میں ابوحیان کے الفاظ پر غور کیجئے

ان السبب کان فی انشاء ھذہ	اس رسالہ کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ میں نے
الرسالة انی ذکرت شیئا منھا	(شاید تصنیف سے پہلے) اس رسالہ کے کچھ اقتباسات
لزید بن رفاعة ابی الخیر فنماہ	ابوالخیر زید بن رفاعہ کو سنائے تھے، اس نے
الی ابن سعدان سنة احدی	اس کا تذکرہ ۳۷۱ھ میں ابن سعدان سے کر دیا،
وسبعین وثلاث مائة قبل تحملہ	یہ اس وقت کا قصہ ہے جب وہ وزارت کی
اعباء الدولة وتدبیرہ امر	ذمہ داریوں سے گرانبار نہیں ہوا تھا اور
الوزارة حین کانت الاشغال	اس کی زندگی پرسکون اور حالات معمول پر تھے۔
خفیفة والاحوال علی اذلالھا	ابن سعدان نے کہا کہ زید نے مجھ سے تمھارے
جاریة فقال ابن سعدان	بارے میں فلاں فلاں باتیں بیان کی ہیں، میں نے
قد قال لی زید عنک کذا وکذا	کہا وہ صحیح ہیں، تو اس نے کہا اس کو ضرور
قلت قد کان ذلک قال فدون	مدون اور ایک سلسلہ میں منسلک
ھذا الکلام وصله لصلابة ..."	کر لو،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۸) ابن عماد حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں "ابوالحسن انباری نے مرثیہ لکھ کر بغداد کی ایک پر رونق سڑک پر پھینک دیا تھا، لوگوں نے اٹھا کر دیکھا تو ابن بقیہ کا مرثیہ تھا، رفتہ رفتہ بادشاہ تک خبر پہنچی، اس نے جب اس مرثیہ کو سنا تو کہا کاش میں ابن بقیہ کی جگہ پر ہوتا اور میرے لیے یہ مرثیہ کہا گیا ہوتا، ابوالحسن انباری بادشاہ کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا، آخر صاحب بن عباد نے امان دیکر بلایا، صاحب نے دربار عام میں اس سے مرثیہ پڑھنے کی فرمائش کی، جب وہ اس شعر پر پہنچا

ولم ار قبل جزعك قط جزعا | تمكن من عناق المكرمات

تو صاحب نے اپنے تخت سے اتر کر شاعر کی پیشانی چوم لی، اور اپنے اثر و رسوخ سے عضد الدولہ سے شاعر کی جان بخشی کا وعدہ بھی لے لیا۔ (شذرات الذہب ج ۳ ص ۷۴)

الصدیق والصداقہ وہ کتاب ہے جس میں ابوحیان نے اپنی زندگی کی ناکامیوں پر آنسو بہائے ہیں،

۵۔ الامتاع والموانسہ میں وزیر اعظم ابن عارض کے جن حاشیہ نشینوں اور مصاحبوں کا تذکرہ آیا ہے، الصدیق والصداقہ میں بعینہ وہی افراد ابن سعدان کے گرد نظر آتے ہیں، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابن سعدان اور ابن عارض ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔[1]

۶۔ عہد بویہی کی تاریخی کتابوں میں تجارب الامم اور اس کا تتمہ بڑے پایہ کی کتابیں ہیں، ان تاریخوں میں ابن سعدان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں، الامتاع والموانسہ میں جس وزیر کے حالات ہیں اس کی تمام خصوصیات ابن سعدان میں پائی جاتی ہیں، اس میں تاریخی جھلکیاں بھی ہیں اور درباری سازشیں بھی ہیں، علمی صحبتوں کا تذکرہ بھی ہے، ابن مسکویہ ایک مشہور حکیم

[1] الصدیق والصداقہ ص ۱۳۱

اور ماہر اخلاقیات، ابن زرعہ نامور عیسائی فلسفی، ابو الوفا، فاضل ریاضی داں، ابن حجاج مشہور شاعر اور ابوحیان جیسا عبقری ابن سعدان ہی دربار کے نورتن ہیں، جو ابن عارض کے دربار میں بھی نظر آتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ابن سعدان کے لیے ابن عارض کا استعمال ابن مسکویہ یا ابن شجاع اور ابن اثیر نے نہیں کیا ہے، لیکن ابوحیان چونکہ اس کے خاندانی حالات سے واقف تھا، اور اس کو دوسروں سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا، اس لیے وہ ابن سعدان کو کبھی ابن عارض کے نام سے بھی یاد کرتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ابن سعدان اور ابن عارض دو شخصیتیں ہیں، صحیح نہیں ہے، اسی غلط فہمی کا شکار ڈاکٹر کرد علی جیسے مورخ بھی ہوئے لیکن مندرجۂ بالا دلائل سے اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے،

الامتاع کے سلسلہ میں ایک بحث ابھی اور باقی ہے، وہ یہ کہ الامتاع کس کی فرمایش پر لکھی گئی؟ میں نے اوپر بتایا ہے کہ ابو الوفاء کی فرمایش پر لکھی گئی، اور اسی کے نام ابوحیان نے اس کو معنون بھی کیا ہے، لیکن جمال الدین قفطی مصنف اخبار العلماء باخبار الحکماء کو اس سے اختلاف ہے، اس کی رائے میں کتاب ابو الوفاء کے لیے نہیں، ابو سلیمان منطقی کے لیے لکھی گئی ہے، وہ لکھتا ہے:

ان اباسلیمان کان اعور وکان بہ وضح وکان ذلک سبب انقطاعہ عن الناس ولزومہ منزلہ فلا یأتیہ الا مستفید وطالب علم وکان یشتھی الاطلاع علی اخبار الدولۃ وعلو ما یحدث بہا... وکان ابوحیان التوحیدی من بعض اصحابہ المعتصمین بہ وکان یغشی مجالس الرؤساء ویطلع علی الاخبار ومعاملہ من ذلک نقلہ الیہ وحاضرہ بہ ولاجلہ صنف کتاب الامتاع والموانسۃ الخ [1]

ابو سلیمان یک چشم تھا، اس کے جسم پر سفید داغ بھی تھے، اس لیے وہ سوسائٹی سے الگ تھلگ اپنے گھر میں گوشہ گیر تھا، اس کے پاس صرف وہی لوگ آتے تھے جو اس چشمۂ علم سے سیراب ہونا چاہتے ہوں، ابو سلیمان کو حکومت کے حالات و حوادث سے بھی دلچسپی تھی، اور اس سے وہ باخبر رہنا چاہتا تھا، ابوحیان توحیدی اس کے خاص شاگردوں میں تھا، وہ امراء کی محفلوں میں جاتا رہتا تھا، اسلیے اس کو ہر قسم کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے، جب اسکو کوئی خبر ملتی تھی تو اپنے استاد سے نقل کر دیتا تھا، اور اس کے لیے اس نے الامتاع والموانسہ لکھی تھی،

لیکن قفطی کو خود تسامح ہوا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ الامتاع ابو الوفاء ہی کے لیے لکھی گئی ہے ابو سلیمان کے لیے نہیں، اس بارے میں حسب ذیل دلائل ہیں:

۱۔ الامتاع والموانسہ میں ابو سلیمان پر چند سخت تنقیدیں ہیں، اگر وہ ابو سلیمان کے لیے لکھی جاتی تو اس میں یہ تنقیدیں نہ ہوتیں یا ان کا لب ولہجہ نرم ہوتا،

۲۔ الامتاع میں کثرت سے ابو سلیمان کے اقوال درج کیے گئے ہیں، اگر وہ اس کے لیے لکھی گئی ہوتی تو خود ابو سلیمان کو اسی کے اقوال سنانے کی ضرورت کیا تھی،

۳۔ الامتاع میں ابوحیان اس شخص سے صلہ کا بھی طالب ہے، جس کے لیے اس نے کتاب لکھی ہے، ابو سلیمان کے افلاس کا یہ حال تھا کہ وہ مکان کا کرایہ بھی مشکل سے ادا کر پاتا تھا، ایسے شخص سے وہ صلہ کا کیا طالب ہوتا [2]، اس کے برعکس ابو الوفاء اس پایہ کا شخص تھا کہ وزیر اعظم بھی اسے "شیخنا" کہہ کر یاد کرتا تھا، وہ بغداد میں بڑی شان سے رہتا تھا، بڑے بڑے امراء سے اس کے تعلقات تھے اسی نے ابوحیان کو البیمارستان العضدی میں ملازمت دلائی تھی، اور اس کو ابن سعدان (وزیر اعظم)

---

[1] اخبار الحکماء ص ۲۸۳ ۔ [2] الامتاع ج ۱ ص ۱۳۰

تک پہنچایا تھا، اس لیے مختلف حیثیتوں سے ابوالوفا کی وہ پوزیشن تھی، جس سے ابوحیان صلہ کا طالب ہو سکتا تھا،

۴۔ الامتاع میں ہے کہ ابن سعدان نے ابوحیان سے کہا، ابوالوفاء کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا، ابوالوفاء کے لیے تو میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، اسی نے مجھکو اس بارگاہ تک پہنچایا ہے،

(۲) **الصداقة والصدیق**۔ (الصداقة والصدیق) پہلی بار اے الجوائب نے ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے شائع کیا۔ پھر ۱۳۲۳ھ میں یہی کتاب قاہرہ سے الادب والانشا، فی الصداقة والصدیق کے نام سے دوبارہ شائع ہوئی۔

دوست اور دوستی کے بارے میں جس قدر مواد فراہم ہو سکتا ہے، وہ سب اس میں موجود ہے: کتاب کے ہر لفظ سے ابوحیان توحیدی کا یہ تاثر نمایاں ہے:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　　بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

اخوانیات کے موضوع پر ادب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، اس کتاب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں یہ نقص بھی ہے، کہ وہ ترتیب و تبویب سے محروم ہے اور اسکی حیثیت کشکول کی ہے۔ یاقوت اس کتاب کو بہت پسند کرتا ہے، اس نے لکھا ہے "کتاب حسن نفیس"[۱]

(۳) **الهوامل والشوامل**۔ یہ کتاب ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ سے پہلی بار شائع ہوئی، اس میں زیادہ تر فلسفیانہ مباحث ہیں جو ادبی انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کتاب میں ابن مسکویہ اور ابوحیان توحیدی کے علمی مذاکرات دیکھنے کے لائق ہیں۔

---

۱ معجم الادبا ج ۵ ص ۳۸۱ (قدیم اڈیشن)

(۴) **البصائر والذخائر**۔ اس کتاب کا پورا نام بصائر القدماء و سرائر الحکماء ہے، اس کی تالیف میں ابوحیان نے ۱۵ سال (۳۵۰ھ تا ۳۶۵ھ) صرف کئے، پوری کتاب دس جلدوں میں ہے،[۱] اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبۂ سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں موجود ہے، یہ نسخہ ۶۱۳ھ کا مکتوبہ ہے اور پانچ جلدوں میں ہے، البصائر کا دوسرا نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لندن میں ہے، یہ نسخہ پہلی اور دوسری جلد پر مشتمل ہے، اور ۱۱۱۷ھ کا مخطوطہ ہے، تیسرا نسخہ جو صرف نویں و دسویں جلد پر مشتمل ہے، قسطنطنیہ کے ایک دوسرے کتب خانہ میں دستیاب ہوا ہے،[۲]

۱۹۵۳ء میں البصائر کی پہلی جلد ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کی نگرانی میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ابوحیان توحیدی کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے "ثمرة العمر و زبدة الایام و ودیعة التجارب"۔ توحیدی نے کتاب کے مقدمہ میں اپنے مآخذ کا بھی تذکرہ کیا ہے، ان میں جاحظ کی تصنیفات سر فہرست ہیں، اس کے علاوہ مندرجۂ ذیل کتابیں بھی اس کے پیش نظر رہیں:

۱۔ کتاب النوادر (ابوعبداللہ محمد بن زیاد الاعرابی)

۲۔ عیون الاخبار (ابن قتیبہ)

۳۔ مجالس ثعلب

۴۔ کتاب المنظوم والمنثور (احمد بن ابی طاہر طیفور مؤلف کتاب بغداد)

۵۔ کتاب الاوراق (الصولی)

۶۔ کتاب الوزراء (الجہشیاری)

۷۔ کتاب الحیوانات (قدامہ)

۸۔ کتاب الکامل (المبرد)

---

۱ معجم الادبا ج ۵ ص ۳۸۲　۲ ابوحیان توحیدی ص ۴۰ از ڈاکٹر ابراہیم کیلانی

(۵) ذم الوزیرین - یہ رسالہ مختلف ناموں سے مشہور ہے، ابن خلکان نے مثالب الوزیرین[1]
حاجی خلیفہ نے ثلب الوزیرین[2]، اور یاقوت نے اخلاق الوزیرین کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے[3]
اس رسالہ کی اکثر عبارتیں صاحب بن عباد کے حالات کے ضمن میں یاقوت نے نقل کی ہیں، ذم الوزیرین
کا مخطوطہ قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۳۳۳)

(لطیفہ) مثالب الوزیرین یا ذم الوزیرین کے بارے میں ابن خلکان کا یہ ریمارک سننے
کے قابل ہے:

هذا الكتاب من الكتب المحذورة	یہ کتاب ممنوعہ کتابوں میں ہے، یہ کتاب
ما ملكه احد الا و انعكست	جس شخص کی ملک میں بھی رہی اس پر تباہی
احواله ولقد جربت ذلك و	آئی۔ خود میں نے اور دوسرے لوگوں نے
جربه غيرى[4]	اس کا تجربہ کیا ہے۔

(۶) النوادر - یہ کتاب ناپید ہے، توحیدی نے المقابسات میں اس کا تذکرہ کیا ہے[5]۔
(۷) تقریظ الجاحظ - یاقوت نے سیرافی اور دینوری کے حالات میں اس کتاب کے اقتباسات نقل کیے ہیں[6]۔
(۸) رسالۃ الحنین الی الاوطان - یاقوت نے اس رسالہ کا تذکرہ معجم الادبا میں کیا ہے[7]،
(۹) رسالۃ فی علم الکتابۃ - توحیدی خود بھی اچھا خطاط تھا، اس لیے اس نے اس رسالہ میں
فن خوشنویسی پر جو کچھ لکھا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، اس میں عربی خط اور اس کے اقسام پر بڑی
محققانہ بحثیں ہیں، یہ رسالہ اس مجموعہ میں شامل ہے، جسے ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ثلاث رسائل لابی حیان
توحیدی کے نام سے مصر سے شائع کیا ہے،

---

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۷۰ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۰ [3] معجم الادبا، ج ۶ ص ۱۸۷ [4] وفیات الاعیان ج ۲ صفحہ ۶

[5] المقابسات ص ۴۸ [6] معجم الادبا، ج ۳ ص ۳، و ج ۸ ص ۱۵۰ [7] ایضاً ج ۱۵ ص ۷

(۱) المقابسات - یہ ابوحیان توحیدی کی مشہور تصنیف ہے، پہلی بار ۱۳۰۵ھ میں ملک الکتاب
مرزا محمد شیرازی کے اہتمام میں بمبئی سے شائع ہوئی، دوسری بار مصر سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی،
اس کا سب سے بہتر اڈیشن وہ ہے جو استاذ حسن سندوبی کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا، المقابسات
کے دو قلمی نسخے (پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے مخطوطے) مکتبہ خالدیہ قوس اور دارالکتب الظاہریہ
دمشق میں موجود ہے۔ المقابسات کے بارے میں ڈاکٹر کیلانی نے حسب ذیل تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

یہ کتاب ایک سو چھ (۱۰۶) مقابسات پر مشتمل ہے، بعض مقابسے طویل ہیں بعض مختصر، یہ مقابسے مختلف
موضوع رکھتے ہیں، یہ گویا چند فی البدیہ لکچر ہیں جو مختلف موقعوں پر اس مجلس علمی میں پیش کیے
گئے تھے جو یحییٰ بن عدی نصرانی اور ابوسلیمان سجستانی منطقی کی صدارت میں ہوتی رہتی تھی، یہ مجلس علمی
کبھی وزیر اعظم ابن عارض کے محل میں منعقد ہوتی، کبھی سوق وراقین میں (جو باب بصرہ کے بالمقابل
باب طاق کے پاس ہے) یا سجستانی کے کسی شاگرد کے یہاں۔ اس مجلس میں ہر طبقہ کے نمائندے
اور ہر مذہب و ملت کے افراد (خواہ وہ کسی عقیدہ کے ماننے والے ہوں) شریک ہوتے، اس کے
شرکا میں فلسفی، طبیب، ریاضی داں، ہیئت داں، مورخ، شاعر، ادیب، متکلم، غرض
ہر صنف کے اصحاب کمال نظر آتے تھے، جو اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے دنیائے اسلام کے
دور دراز علاقوں سے آتے تھے، عام طور پر مجلس میں فلسفہ اور تصوف کی بحثیں زیادہ ہوتیں،
طالبان علوم اپنی بیاضیں کھول کر بیٹھتے، اور صدر محفل جو جواب دیتا اسے نوٹ کر لیتے،
جب کسی مسئلہ پر اتفاق نہ ہوتا تو صدر اپنی رائے دیتا، جس سے لوگوں کی تشفی ہو جاتی۔"[1]

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:-

وهو كتاب مفيد جدا ولعل	یہ بڑی مفید کتاب ہے، معلوم ہوتا ہے حریری
الحريرى حذا حذوه[2]	نے اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] ابوحیان ص ۴۳ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۹۱

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے:-

ذکر المؤلف فی ھذا الکتاب بعض ماوقع لہ من مفاوضات علماء عصرہ[1]

مولف نے اس کتاب میں ان علمی مذاکرات کا تذکرہ کیا ہے جو اس کے عہد کے علماء کے درمیان ہوا کرتے تھے،

اکتفاء القنوع کا مصنف اڈورڈ فنڈیک لکھتا ہے:-

کتاب المقابسات ھذا من اھم الکتب لوقوف الباحث علی تاریخ الفلسفۃ[2]

فلسفہ کی تاریخ پڑھنے والے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے،

(۲) رسالۃ فی ضلالات الفقہاء - یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[3]۔

(۳) المحاضرات والمناظرات - یاقوت نے معجم الادباء میں، ابن عربی نے مسامرات میں اور غزولی نے مطالع البدور میں اس کا تذکرہ کیا ہے[4]،

(۴) الاقناع - کشف الظنون میں اس کا تذکرہ ہے[5]،

(۵) التذکرۃ التوحیدیہ - غرر الخصائص الواضحہ کے مصنف نے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے[6]،

متصوفانہ تصنیفات

الاشارات الالٰہیۃ والانفاس الروحانیہ - ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی نے ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے اسے شائع کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ دار الکتب الظاہریہ دمشق میں موجود ہے، جو ۱۰۴۷ھ کا مخطوطہ ہے، اس کتاب کا اختصار برلن کے کتب خانہ میں ہے[7]، الاشارات میں ۴۵ رسائل ہیں، جو مواعظ ادعیہ پر مشتمل ہیں[8]، ڈاکٹر کیلانی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:-

یہ کتاب ادعیہ اذکار کے موضوع پر ہے، اس میں ۴۵ ابواب ہیں جس میں ابوحیان توحیدی نے بڑے والہانہ انداز سے انتہائی دلکش زبان میں دعائیں مانگی ہیں، ابوحیان توحیدی کی آخری عمر

[1] المقتبس ذی ۱۳۳۱ھ [2] اکتفاء القنوع ص ۱۸۵ [3] معجم الادباء ج ۱۵ ص ۷، [4] ایضاً ج ۱ ص ۸۰ ۵ ج ۸ ص ۱۵۲ و مسامرات ج ۲ ص ۷، و مطالع البدور ج ۲ ص ۶۲ [5] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۲ [6] غرر الخصائص الواضحہ ص ۳۳

[7] فہرست اہلوارڈ نمبر ۲۸۱۰ [8] شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۰

کی تصنیف ہے، جب اس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی، اور اس کے مزاج کی حدت اور شعلہ فشانی ختم ہو چکی تھی، اس کے دل میں دنیا کی ہوس کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہ گیا تھا، اور اب وہ سکون کا متلاشی تھا، اور ایسی زندگی چاہتا تھا جس میں دنیا کی کوئی آرزو نہ ہو، اور آخرت کی تلاش جس کا مقصد ہو، اسی لیے اس میں جو دعائیں ہیں اس سے اس کا سوز دروں معلوم ہوتا ہے[1]

الحج العقلی اذا ضاق الفضاء عن الحج الشرعی - یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[2]، ڈاکٹر کرد علی کے بیان کے مطابق اس کتاب کا قلمی نسخہ لینن گراڈ کے کتب خانہ میں موجود ہے[3]۔

الزلفی - یاقوت نے معجم الادباء میں اور ابوشجاع نے ذیل تجارب الامم میں اس کا تذکرہ کیا ہے[4]،

ریاض العارفین - یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[5]،

رسالۃ فی اخبار الصوفیۃ - الرسالۃ القشیریہ کے طرز پر یہ رسالہ لکھا گیا ہے، دنیادار صوفیوں نے اپنی حرکتوں سے تصوف کو اتنا بدنام کر دیا تھا کہ لوگوں کا میلان تصوف کی جانب سے کم ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کے لیے توحیدی نے یہ رسالہ لکھا تھا[6]،

رسالۃ الحیٰوۃ - ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ۱۹۵۱ء میں دمشق سے اسے شائع کیا ہے،

رسالۃ فی بیان ثمرات العلوم - یہ سات صفحہ کا مختصر رسالہ ہے، الصداقۃ والصدیق کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہوا ہے، یہ رسالہ ان لوگوں کے رد میں ہے جو مذہب میں فلسفہ کی ضرورت نہیں سمجھتے،

رسالۃ الامامۃ المعروفۃ بروایۃ السقیفہ - یہ رسالہ شیعوں کے رد میں ہے، ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ۱۹۵۱ء میں اسے شائع کیا ہے،

[1] ابوحیان ص ۴۳ [2] معجم الادباء ج ۱۵ ص ۸ [3] امراء البیان [4] معجم الادباء ج ۵ ص، و ذیل تجارب الامم ج ۳ ص ۵، [5] معجم الادباء ج ۱۵ ص ۷، [6] الصداقۃ والصدیق ص ۱۹۶

المناظرة بین ابی سعید السیرافی ومتی بن یونس القنائی ۔ الامتاع والموانسہ جلد اول ص۱۰۸ تا ص۱۲۸ میں یہ رسالہ موجود ہے، ۱۹۰۵ء میں اس رسالہ کا انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہوا، رسالہ الہلال (تیرہواں سال) ص ۴۳۸[۱]

بعض غیر معروف تصانیف الرسالۃ البغدادیۃ ۔ یاقوت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۲]

رسالۃ الی ابی الفضل ابن العمید ۔ براکلمن نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۳]

کتاب الرد علی ابن جنی فی شعر المتنبی ۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اور علامہ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۴]

---

[۱] معجم المطبوعات العربیہ ج ۲ ص ۳۰۵ [۲] معجم الادباء ج ۵ ص ۷، [۳] ملحق ۱ ص ۴۳۶ [۴] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۸۰ قدیم اڈیشن و بغیۃ الوعاۃ ص ۳۴۸

حکمائے اسلام

حصۂ اوّل

یہ کتاب دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات میں ہے، جلد اول پانچویں ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے۔

(از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم)

ضخامت ۵۰۴ صفحے قیمت عہ

منیجر

امام بخاری

اور

اُن کی جامع کی خصوصیات

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ صحیحین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ نے بہت سی ایسی روایات سے استدلال کیا ہے، جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، پھر صحیحین کے اصح ہونے کا کیا مطلب ہے، تحریر کے شارح ابن امیر الحاج نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیحین کی اصحیت مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے، وہ ائمہ مجتہدین جو ان کے پیشتر گذرے ہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں[۱]، علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ شیخین اور اصحاب سنن وغیرہ فقہ اسلامی کی تدوین کے بعد پیدا ہوئے اور حدیث کی طرف اعتناء کیا لیکن ائمہ مجتہدین جو ان سے پیشتر گذرے ہیں ان کے سامنے مرفوع و موقوف اور صحابہ و تابعین کے فتاوی کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، اور مجتہد کی نظر حدیث کی صرف ایک قسم پر محدود نہیں ہوتی، آج ہمارے سامنے اس دور کی جوامع و مصنفات موجود ہیں، جن کے مصنفین ائمہ مجتہدین کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں، اس لیے علوے طبقہ کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے لیے احادیث کی اسانید پر غور و خوض کرنا آسان تھا، پھر مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال اس کی صحت کی دلیل ہے، کتب ستہ

---

[۱] التقریر والتحبیر ج ۳ ص ۳۰ [۲] حاشیہ شروط الائمہ

کی ضرورت اور ان سے استدلال مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے،[1]

امام اعظم ابوحنیفہ سے روایت نہ کرنے کی وجہ

کہا جاتا ہے کہ امام بخاری چونکہ حنفیہ سے ناراض تھے، اس لیے انھوں نے امام ابوحنیفہ سے کوئی روایت نقل نہیں کی، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے شدت تعصب اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر بے جا تنقید کی وجہ سے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں نہیں نقل کی،[2] اسی طرح بعض الناس کے ذریعہ امام صاحب پر تعریض کی ہے اور ان پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے امام اعظم کے ساتھ وہی روش اختیار کی ہے جو امام جعفر صادق کے ساتھ کی تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق کو امام بخاری نے قابلِ استدلال نہیں سمجھا، حالانکہ وہ جمہور امت کے نزدیک ثقہ ہیں،[3]

لیکن امام بخاری اور دیگر ائمہ محدثین کے متعلق عناد و تعصب کا شبہہ کرنا نہایت نامناسب ہے، اکابر کی شان اس سے بلند تھی، علامہ کوثری نے اس بارہ میں نہایت مناسب و معتدل رائے ظاہر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قابل غور امر یہ ہے کہ شیخین نے امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں نقل کی، حالانکہ ان کے صغیر السن تلامذہ سے ان کا لقاء و روایت دونوں ثابت ہے، اسی طرح امام شافعیؒ کے بعض تلامذہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی، لیکن امام شافعی کی کوئی روایت اپنی کتاب میں درج نہیں کی، امام بخاری کو امام احمد سے زیادہ ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اسکے باوجود ان سے صرف دو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، ایک تعلیقاً اور دوسری ایک واسطے سے، امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد ہیں، اور انھوں نے اپنی کتاب میں ان سے پورا استفادہ کیا ہے، لیکن امام بخاری سے صحیح مسلم میں کسی روایت کی تخریج نہیں کی، امام احمد امام شافعی کے تلمیذ رشید ہیں، اور ان سے موطا امام مالک کا

[1] لامع ص ۴۴ [2] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۵ [3] ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۲۸

سماع بھی کیا ہے لیکن امام مالک کی کل پانچ روایات امام شافعی کے واسطے سے اپنی کتاب میں درج کی ہیں، ان واقعات اور ان محدثین کرام کے اخلاص و دیانت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ محدثین کی احادیث کو روایت کرنے والے شرق و غرب ہر چہار سو پھیلے ہوئے تھے، ان کے ضایع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، اس لیے ان محدثین کرام نے صرف راویوں کی روایات کی طرف توجہ مبذول فرمائی، جن کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے ان محدثین کا دامن ہر تعصب و عناد سے پاک تھا،[1]

جامع صحیح کے شروح و حواشی

جامع صحیح کی اہمیت و مقبولیت کی بنا پر ہر دور کے علما نے اس پر شروح و حواشی لکھے ہیں، لامع میں ایک سو سے زائد شروح و حواشی اور متعلقات بخاری کا تذکرہ ہے، ان میں سب سے زیادہ فتح الباری کو شہرت حاصل ہوئی،

(۱) **فتح الباری** ۔ یہ شیخ الاسلام حافظ ابوالفضل احمد بن علی بن حجر م ۸۵۲ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۱۷ھ سے اس کا آغاز کیا، سب سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جب وہ مکمل ہوگیا تو شرح کی تالیف شروع کی، ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب شرح کا معتد بہ حصہ ہوجاتا تو اس کو ائمہ محدثین کی ایک جماعت نقل کرتی، پھر ہفتہ میں ایک دن اس پر مباحثہ و مقابلہ کیا جاتا، علامہ برہان بن خضر پڑھتے اور لوگ اپنے اعتراضات اور بحث پیش کرتے تھے، حافظ صاحب جواب دیتے، اس طرح یہ کام ۸۴۲ھ میں ختم ہوا، مگر اس کے بعد مصنف نے اس پر کچھ اضافے بھی کیے، اور اس کی تکمیل وفات سے کچھ مدت پہلے ہوئی،

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے، کہ بخاری کی شرح کا دین امت پر باقی ہے، حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ غالباً فتح الباری سے یہ دین ادا ہوگیا،

[1] حاشیہ شروط الائمہ ص ۵۰

اس میں مصنف نے جامع صحیح کے ان نکات پر جو فن رجال یا تراجم ابواب کی تدقیقات فقہیہ سے متعلق ہیں محققانہ بحث کی ہے اور حدیث کے مختلف طرق کو جمع کیا ہے جس سے حدیث کے کسی ایک احتمال یا اعراب کی تعیین ہو جاتی ہے۔ (ارشاد الساری ص ۳۶)

(۲) عمدۃ القاری ۔ علامہ بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۲۱ھ سے اس کی ابتدا کی اور ۸۴۷ھ میں یہ شرح مکمل ہوئی، اتنی مدت اس لیے صرف ہوئی کہ درمیان میں مختلف موانع کی بنا پر متعدد بار اس کام کو بند کرنا پڑا، ورنہ زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت صرف ہوتی، علامہ عینی نے فتح الباری سے بہت استفادہ کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے بعض بعض ورق پورے کے پورے نقل کر دیے ہیں، علامہ عینی نے اپنی شرح میں حافظ ابن حجر پر تعقبات بھی کیے ہیں، اور جن باتوں کو انھوں نے بالقصد ترک کر دیا تھا، انکی تفصیل کر دی ہے، مثلاً (۱) حدیث کے پورے متن کو نقل کر دیا ہے، (۲) رواۃ کے انساب کی وضاحت کی ہے، (۳) ہر راوی کا ترجمہ دیا ہے، (۴) لغات و اعراب، معانی و بیان کی وضاحت کی ہے، اور حدیث سے مسائل کا استنباط کیا ہے، اشکالات و جوابات فتح الباری سے زیادہ ہیں۔ (مقدمہ ارشاد الساری ص ۳۶)

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ عمدۃ القاری فتح الباری سے ایک ثلث مقدار میں زیادہ ہے، اس میں مختلف مباحث کی ایسی وضاحت کی گئی ہے کہ قاری کو کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں رہتی، اگر فتح الباری کا مقدمہ نہ ہوتا تو عمدۃ القاری کو اس پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی، عینی نے حافظ ابن حجر کے بہت سے اوہام پر تنبیہ کی ہے، اور جب یہ کتاب ان کے سامنے آئی تو حافظ ابن حجر نے ان مقامات کی اصلاح کر لی، اور علامہ عینی کی تردید میں ایک رسالہ انتقاض الاعتراض لکھنا چاہا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، اس لیے یہ رسالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، علامہ عینی حافظ ابن حجر

کے شیوخ کے صف کے آدمی ہیں، وہ عمر میں حافظ ابن حجر سے ۱۲ سال بڑے تھے، البتہ ان کا انتقال تین سال بعد ہوا۔

(۳) ارشاد الساری ۔ شہاب احمد بن محمد الخطیب القسطلانی المصری صاحب المواہب اللدنیہ المتوفی ۹۲۳ھ ۔ اس میں شرح و متن مخلوط ہے، لیکن متن کو سیاہی و سرخی سے ممتاز کر دیا ہے، حقیقت میں یہ فتح الباری، عمدۃ القاری کی تلخیص ہے، اگرچہ مصنف نے دوسری شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

(۴) الکواکب الدراری ۔ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی کرمانی ۷۸۶ھ ۔ حافظ ابن حجر اور عینی نے اپنی شرحوں میں اس سے بہت کچھ لیا ہے، مصنف نے اس میں نحوی اعراب اور غریب الفاظ کو پوری طرح حل کیا ہے، یہ شرح مصر میں چھپ گئی ہے۔

(۵) شرح النووی ۔ امام نووی المتوفی ۶۷۹ھ نے صرف کتاب الایمان تک شرح لکھی تھی، اس کی تکمیل نہیں کر سکے، صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس کا ذکر ہے۔

(۶) ہدایۃ الباری ۔ شیخ الاسلام زکریا الانصاری تلمیذ حافظ ابن حجر المتوفی ۹۲۸ھ مصر سے چھپ چکی ہے۔

(۷) تیسیر القاری ۔ علامہ نور الحق بن مولانا عبد الحق الدہلوی، المتوفی ۱۰۷۳ھ جس زمانے میں شیخ عبد الحق نے مشکوٰۃ شریف کی شرح لکھی تھی، اسی زمانہ میں انکے صاحبزادے علامہ نور الحق نے صحیح بخاری کی شرح فارسی میں لکھنی شروع کی۔

(۸) التوشیح علی الجامع الصحیح ۔ حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی لطیف شرح ہے، اس کی تلخیص علامہ دمشقی نے کی ہے، اور اس کا نام روح التوشیح رکھا ہے، طبع ہو چکی ہے۔

(۹) شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح ، شیخ جمال الدین الشافعی المتوفی ۶۷۲ھ کا

رسالہ ہے، جو ہندوستان میں طبع ہو چکا۔

(۱۰) علامہ ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی السندی الحنفی کا حاشیہ جو مشہور و معروف ہے، یہ بھی طبع ہو چکا ہے،

(۱۱) شرح شیخ الاسلام بن محب اللہ البخاری الدہلوی، یہ فارسی شرح تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے، مگر صرف ۱۴ پارے ہی طبع ہوئے ہیں،

(۱۲) عون الباری، نواب صدیق حسن خانصاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ نے تجرید بخاری کی مختصر شرح لکھی ہے۔

(۱۳) نبراس الساری فی اطراف البخاری۔ مولانا ابو سعید محمد عبد العزیز الحنفی کی تصنیف ہے،

(۱۴) فیض الباری، علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے افادات ہیں، جو ان کے تلمیذ رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے درس کے وقت لکھے تھے،

(۱۵) مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری المتوفی ۱۲۹۸ھ کا حاشیہ جس کے آخری حصے کی تکمیل حضرت نانوتوی نے کی، نہایت مفید ہے،

(۱۶) لامع الدراری، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ کے درس کے افادات ہیں جن کو ان کے مختلف تلامذہ نے جمع کیا تھا، سب سے آخری دورہ جس میں ملک کے بڑے بڑے علماء و فضلاء شریک تھے، اور اس کے بعد سلسلۂ درس ختم ہو گیا تھا، اس دورہ میں حضرت کے مایۂ ناز شاگرد مولانا محمد یحیٰی صاحب شریک تھے، بلکہ ان ہی کی خاطر حضرت نے اس دورہ کا افتتاح فرمایا تھا، اس آخری درس کے افادات کو حضرت کے تلامذہ نے قلمبند کیا تھا، اس پر حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے تعلیق اور ایک مبسوط مقدمہ لکھا، اس کا مطالعہ حدیث طلباء و اساتذہ کے لیے بہت مفید ہے، اسکی جلد اول طبع ہو چکی ہے اور جلد ثانی زیر طبع ہے، اس مضمون کا بیشتر حصہ اسی سے ماخوذ ہے۔

ٹیپو سلطان شہید کا ایک اہم اور تاریخی مکتوب

بنام

نواب نظام علی خاں

از جناب سید امین الحسینی صاحب حیدر آباد

یہ وہ تاریخی مکتوب ہے جس کو نواب شہید نے نواب نظام علی خاں کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ نواب صاحب حقیقی واقعات سے واقف ہو کر انگریزوں کی حمایت سے اپنے آپ کو باز رکھیں اور ان خود غرض عہدہ داروں کے مشوروں پر بھی نہ چلیں جن کو ریاست کے مفاد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور محض اپنی ذاتی اغراض کی خاطر غلط رہبری کرتے تھے،

یہ مکتوب اصل میں فارسی زبان میں ہے، جس کو جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، سابق مشیر تحقیقات و اشاعت کاغذات تاریخی سنٹرل ریکارڈز آفس و صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے مختصر تمہید کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ مضمون کی شکل میں انڈین ہسٹری کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بمقام جے پور پیش کیا تھا،

چونکہ یہ مضمون انگریزی زبان میں تھا، اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اجازت سے اس تاریخی اہم مکتوب کا اردو ترجمہ اس طریقہ سے کیا ہے کہ مکتوب کے صحیح خط و خال بھی واضح ہو جائیں اور اس کے اہم نکات بھی چھوٹنے نہ پائیں،

تمہید کا ترجمہ | سنٹرل ریکارڈز آفس کے ذخیرۂ مخطوطات میں ٹیپو سلطان کے مکتوب کی نقل موسومۂ

نواب نظام علی خاں محفوظ ہے، لیکن تاریخ سے معرا ہے، لیکن اندازے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مکتوب جنوری ۱۷۹۱ء کا تحریر کردہ ہے، جب آصفی اور انگریزی افواج مشترکہ طور پر سرینگا پٹن پر حملہ آور ہونا چاہتی تھیں،

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مکتوب گورم کنڈہ کے واقعہ کے بعد اس وقت لکھا گیا ہو جب نواب نظام علی خاں کی فوج جنوری ۱۷۹۰ء میں بری طرح پھنس گئی تھی،

اس مکتوب میں ٹیپو سلطان نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ وہ خود غرض مشیروں کے ایما پر انگریزوں کی حمایت کرتے ہیں اور تعجب ہے کہ وہ کس طرح اسد علی خاں اور حافظ فرید الدین جیسے ناقابل اعتماد اشخاص پر بھروسہ کرتے ہیں،

نواب نظام صلح نامہ ۱۷۹۰ء کے بموجب ان کے اور کمپنی کے درمیان طے پایا تھا، ایک بڑی فوج کے ساتھ حیدرآباد سے نکلے، اور پانگل میں قیام کیا، پھر وہاں سے ایک رسالہ بسر کردگی راجہ تیجونت اور اسد علی خاں ان ہدایات کے ساتھ بھیجا کہ وہ ٹیپو سلطان کے علاقے میں داخل ہوں اور موقع و محل دیکھکر کمپنی کی فوجوں سے ربط پیدا کریں، آصفی فوجوں کی رفتار عمداً اس لیے سست رکھی گئی تھی تاکہ اس کی قوت برقرار رہے، اس کے برخلاف انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی فوجوں نے ایک دوسرے کا مقابلہ کرکے اپنے آپ کو کمزور بنا لیا تھا، اس کے علاوہ انگریزی دستہ جو معاہدہ کے مطابق حضور نظام کی فوجوں کے ساتھ تھا، وہ بالکل غیر تربیت یافتہ تھا،

حضور نظام کی فوجوں نے ۱۵ اپریل ۱۷۹۱ء کو قلعہ کپل پر قبضہ کر لیا، اور ایک ہفتے کے بعد دوسرے مضبوط قلعہ "بہادر بنڈہ" پر بھی قابض ہوگئی، کھم اور سدھوٹ اور گنجی کوٹا کے قلعے بھی آصفی فوج کے تصرف میں آگئے، اس کے بعد ۱۹ ستمبر ۱۷۹۱ء کو گورم کنڈہ کا محاصرہ کر لیا گیا، اسی اثنا میں شہزادہ سکندر جاہ مشیر الملک کے ہمراہ ایک بہت بڑی امدادی فوج لیکر گورم کنڈہ

پہنچ گئے، شہزادے نے اولاً تو یہ کیا کہ پانچ ہزار پیدل اور نو سو سواروں کو حافظ فرید الدین کے زیر اہتمام قلعہ پر تاخت کے لیے متعین کیا، اور خود سرینگا پٹن کا رخ کیا، لیکن جونہی وہ گورم کنڈہ پہنچے تیس میل کے فاصلے ہی پر انھیں خبر ملی کہ ٹیپو سلطان کے بڑے فرزند دس ہزار فوج کے ساتھ قلعے کے سامنے مقابلے کے لیے تیار کھڑے ہیں، حافظ فرید الدین یہ خیال کرکے کہ حملہ آوروں کی کوئی بڑی تعداد نہ ہوگی ہاتھی پر سوار ہوکر تھوڑے سے سواروں کے ہمراہ طلایہ گردی کی غرض سے نکلا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام ساتھیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے، اور اس کو قید کرکے قتل کر دیا گیا،

مکتوب کا ترجمہ | مخلوق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قادر مطلق کا شکر ادا کرتی اور سجدۂ عبودیت بجالاتی رہے، کیونکہ وہ اس کو عدم سے وجود میں لایا، اور اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ مصیبت و آفت کے وقت اپنے پیغمبر سے مدد طلب کرے،

جب حضور والا نے رود کرشنا کے اس پار کے علاقہ جات کو فتح کرنے کا قصد فرمایا تھا تو متعدد مرتبہ حضور والا کے سمع ہمایونی تک یہ پہنچایا گیا تھا کہ بلحاظ تعلقات دوستانہ ان عزائم کی جانب توجہ نہ فرمائی جائے،

اگرچہ حضور والا نے یقیناً ان خیالات کو جگہ نہیں دی ہوگی، لیکن چند شریر النفس اشخاص کی بد طینتی، کمینہ پن اور خفیہ طور پر انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے، حضور والا کو برے عزائم کا مشورہ دیا، ایسے اشخاص کے پیش نظر ریاست کی فلاح کبھی نہیں ہوسکتی، انھوں نے محض اپنی ذاتی اغراض کی خاطر حضور والا کو ایک خطرناک موقف میں جھونک دیا۔

یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ اس وقت حضور والا اور انگریزوں کی فوجیں مشترکہ طور پر پانگل پہنچ چکی ہیں، لیکن ہماری کسی فوج کو حرکت نہیں دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا بنڈہ درگاہ کے علاقہ کے کسی ایک

قلعے ہاتھ سے نکل گئے، اور یہ شکست اس لیے ہوئی کہ ہمارے تعلقہ داروں نے غداری کرکے قلعوں کو حضور والا کے عہدہ داروں کے حوالے کر دیا، اس کے باوجود ہم نے چشم پوشی اختیار کی،

اسد علی خاں جو ہمارا مردود بارگاہ ہو چکا تھا، حکومت حیدر آباد نے اس کی بڑی آؤبھگت کی، حالانکہ ہمارے ایک مقامی ضلع دار قطب الدین نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کو نیچا دکھایا، اور اس کو زخمی کرکے ایک داغ بھی لگا دیا تھا، جو اس سرکار کی نشانی ہے، اس نشانی کو وہ اپنے ہمراہ لے گیا، اور باوجود اس کے وہ نادم نہیں ہوا، بلکہ وہاں جاکر فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ہمت و شجاعت کا ڈنکا پیٹا، ایسے شخص کو حیدر آباد میں "مظفر الملک" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، اور شہزادہ سکندر جاہ وزیر اعظم، اعظم الامراء کے ہمراہ ہمارے مقابلے کے لیے بھیجے گئے، انھوں نے ہمارے علاقے کو فوجوں سے خالی پاکر گورم کنڈہ کا محاصرہ کر لیا، کہا جاتا ہے کہ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو چمگادڑیں میدان میں نمودار ہو کر اپنے کرتب دکھانا شروع کرتی ہیں،

حافظ فرید جو کچھ عرصہ کے لیے حضور والا کے وکیل کی حیثیت سے اس دربار میں متعین تھا، اس کی قابل ملامت حرکات کی وجہ سے اسکو حیدر آباد واپس بلا لیا گیا لیکن موید الملک کے خطاب سے اسکی عزت افزائی کی گئی، اور منصب پنجہزاری و پنجہزار سوار سے سرفراز کیا گیا، اور حالیہ مہم میں گورم کنڈہ کے محاصرہ کا کمانڈر بنا دیا گیا، وہ بے وقوف تو محض شیخی باز ہے، اور دربار حیدر آباد میں اس نے اپنے آپ کو ایک بڑا آزمودہ کار سپاہی مشہور کر رکھا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اسلاف میں سے کسی نے بھی جنگ کی صورت تک نہیں دیکھی ہے، پہلے پہل تو ہماری فاتح فوجوں نے اس کا مقابلہ کرنے سے تامل کیا، لیکن بعد میں اس ریاست کی روایات و وقار کے مطابق یہ ضروری سمجھا گیا کہ ہماری فاتحانہ پیشقدمیوں کو ان لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں جنھوں نے گورم کنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، اور یہ احکام جاری کیے گئے کہ محاصرین کو نجات دلانے کے لیے خاندان شاہی کے

ایک رکن کے زیر کمان ایک فوج بھیجی جائے، اور محمد قمر الدین نے بھی مع اپنی بہادر فوج کے اس جانب رخ کیا، حالانکہ قریب ہی میں نعمت خاں والی کرنول کے فرزند اعظم خاں اور کشن راؤ ہلال کے فرزند گوبند کشن کی فوجیں بھی موجود تھیں، لیکن ان کی تنبیہ مقصود نہیں تھی، اس لیے ان کا مقابلہ نہیں کیا گیا، اور قلعہ کی حدود میں ہماری فوجوں نے صرف راجہ جودہ سنگھ کے دستہ کا مقابلہ کر کے اس کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا،

اس کے بعد حافظ فرید الدین کے ہراول کی باری آئی، لیکن اس نے ہماری حملہ آور فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، حافظ ایک نہایت ہی آراستہ پیراستہ ہاتھی پر سوار ہو کر انتہائی رعونت کے ساتھ جنگ کے اصولوں کے بالکل خلاف طلایہ گردی کے لیے نکلا، حالانکہ فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے اس کو فوج کے عقبی حصے میں رہنا چاہئے تھا، اس لیے ہماری حملہ آور فوجوں نے اس پر اس طرح حملہ کیا جس طرح ایک شکاری اپنے شکار پر حملہ کر کے دبوچ لیتا ہے، اور حافظ فرید الدین ہمارے شیر دل سپاہیوں کے درمیان گھر کر زندہ گرفتار کر لیا گیا، اور جملہ سپاہیوں کا صفایا کر دیا گیا اور ہمارے غازیوں نے سامان حرب و رسد کی ایک بڑی مقدار کے علاوہ ایک معتدبہ خزانے پر بھی قبضہ کر لیا، ہمارے بہادر سپاہی حضور والا کی پوری فوج کا قلع قمع کر سکتے تھے، لیکن محض شہزادۂ سکندر جاہ کے پاس خاطر سے اس سے باز رہے،

چونکہ حیدر علی کے بعض نصائح میں یہ بھی اشارہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کے خون سے بچا جائے اس لیے بھی مکمل احتیاط برتی گئی، شام کے وقت ہماری فاتح افواج نے ایک فرانسیسی افسر کو زندہ گرفتار کر لیا جس نے گورم کنڈہ کے بائیں حصہ پر قبضہ کر لیا تھا، اور اس کے جملہ ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، لیکن ان قیدیوں کو معافی دیدی گئی جنھوں نے امن کی درخواست کی تھی، اور دوسرے دن ان کی صلاحیتوں کے مطابق انھیں خدمتیں بھی دی گئیں اور موزوں و مناسب کام تفویض کیا گیا،

اس مکتوب کے بھیجنے کی اصل غایت یہ ہے کہ حضور والا کی سمع ہمایونی تک ان واقعات کو پہنچا دیا جائے اب بھی وقت نہیں گیا ہے، اور حضور والا کے ہاتھوں میں بہت کچھ ہے، حضور والا اس وقت بھی انگریزوں کو مدد دینے سے انکار کر سکتے ہیں، اور مرہٹوں کو بھی جو حضور والا کے معاہدین میں ہیں، اس کی ترغیب دی جا سکتی ہے، انگریزوں کا یہ خیال کہ وہ محض اپنی فوج اور توپخانوں پر بھروسہ کر کے فتح حاصل کر سکتے ہیں، بالکل باطل ہے، اور وہ بہت جلد اپنی تباہی کو دیکھ لیں گے، اگر وہ اپنے برے عزائم پر اڑے رہے تو عید اضحیٰ کے بکروں کی طرح ذبح کر دیے جائیں گے، اور ان کی خوش کن توقعات کی کشتی تباہی کے سمندر میں غرق کر دی جائے گی، وہ اس فکر میں ہیں کہ سلطنت حیدری کو اپنی فوجی قوت سے مسمار کر دیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا. کون قوت ایسی ہستی کا تخت و تاج چھین سکتی ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اقتدار اور دولت دی ہو، اس لیے ان کو اپنے برے عزائم اور کبر و نخوت کی سزا بھگتنی پڑے گی،

یہ ہماری عین خوشی ہے کہ وہ ملک جو قدیم زمانہ سے بشمول ادھونی، معہ ملحقات حضور والا کے تصرف میں اور حضور والا ہی کے نظم و نسق کے ماتحت رہے، اس سلسلہ میں دربار پونہ کے دعاوی بھی معرض بحث میں لائے جا سکتے ہیں، تاکہ ان کا مناسب تصفیہ کیا جا سکے،

میدان کارزار سے حیدرآباد کو حضور کی مراجعت فرمائی تقویت اسلام کا موجب ہوگی، اور اگر مرہٹے بھی اس سے اتفاق کر کے پونہ واپس ہو جائیں تو دوستانہ تعلقات کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں گی،

یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ دولت آصفیہ پھلے پھولے، اگر حضور والا بھی نواب آصف جاہ بہادر کی طرح شمالی ہند کا قصد فرمائیں تو بندۂ درگاہ بھی ہمراہ رکاب رہے گا، اور اس بارہ میں علحدہ خط و کتابت کرے گا.

میں دست بدعا ہوں کہ آصفی ریاست کو ترقی ہو اور اس کا وجود برقرار رہے.

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی

۱۳ر اگست ۱۹۲۷ء

مکرم محترم دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'. براہ کرم بواپسی ڈاک مجھے مطلع فرمائیں کہ کمیٹی[1] کی رپورٹ کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے، رپورٹ کا اردو ترجمہ میرے پاس بھی پہنچا ہے، مگر اس میں صرف حصہ اول کا ترجمہ ہے، اس میں سے بھی باب سوم بالکل نہیں ہے،

جناب نے اس سے اتفاق کیا ہے یا کچھ ترمیمیں لکھی ہیں، آپ کی سب کمیٹی نے کیا فیصلہ کیا ہے اور یہ کہ ۲۰ لغایۃ ۲۲ر اگست کو آپ لکھنؤ کے جلسہ میں شریک ہوں گے یا نہیں، غالباً یہ آخری جلسہ ہوگا،

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

مدرسہ امینیہ دہلی

---

[1] غالباً اس سے مراد الہ آباد بورڈ کے امتحانات عربی و فارسی کے ترتیب نصاب کی کمیٹی ہے،

۳۱ اگست ۱۹۲۷ء

جناب محترم دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الہ آباد کے خط سے معلوم ہوا کہ آیندہ کمیٹی کا جلسہ ۱۶ تا ۱۸ ستمبر لکھنؤ میں ہوگا، مجھے کچھ معلوم نہ ہوا کہ جناب نے کیا ترمیمات کی ہیں، اگر ہوسکے تو اس کی نقل بھیجدیں، اور نہ ہوسکے تو کم از کم یہ کیجئے کہ ۱۵ ستمبر کو لکھنؤ پہنچ جائیے، میں بھی ۱۵ کو لکھنؤ آجاؤں اور لکھنؤ کے ممبران فرنگی محل اور میں اور آپ ملکر متفقہ یادداشت تیار کرلیں، تاکہ علماء کی طرف سے متفقہ تحریر پیش کیجاسکے، براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

امید کہ مزاج سامی مع الخیر ہوگا،

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ ۔ مدرسہ امینیہ دہلی

۸ اگست ۱۹۲۸ء

جناب محترم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ جناب والا کے عرس افضال کی آبیاری کا شاید علم ازلی میں وقت مقدر قریب آگیا ہے، خادم کا ارادہ ہے کہ ۱۱ یا ۱۲ اگست کو دہلی سے بعزم اعظم گڈھ روانہ ہو، خدا تعالیٰ پورا کرے،

مولانا احمد سعید صاحب میرے رہبر ہوں گے، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا، فقط

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

کوچۂ چیلان۔ دہلی

۱۶ اگست ۱۹۲۸ء
دہلی

حضرت مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ جناب کی خدمت سے جدا ہوکر ساڑھے پانچ بجے لکھنؤ اور وہاں سے ۶ بجے روانہ ہوکر پونے آٹھ بجے کانپور اور وہاں سے آٹھ بجے روانہ ہوکر صبح ۵ بجے دہلی پہنچ گیا، اس طریقہ سے راستہ جلد طے ہوگیا، ورنہ مرادآباد کے راستہ سے دس بجے دہلی پہنچتا۔

جناب والا کے کرم و الطاف بے پایاں کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا، میں آپ کی مہربانیوں کے نہایت عمیق احساسات دل میں لایا ہوں، جو ہمیشہ باقی رہیں گے، مولانا مسعود علی صاحب مولانا عبدالسلام صاحب، شاہ صاحب، مولوی سید محمد صاحب، سید نجیب اشرف صاحب ایم اے اور دیگر رفقاء و کارکنان دارالمصنفین سے سلام عرض ہے، مولانا احمد سعید صاحب سلام فرماتے ہیں، ۳۹ لعہ کتابوں کی قیمت کے مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر بھیجد ئے۔

خادم

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

۱۷ دسمبر ۱۹۲۸ء

حضرت محترم دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ نے معزز و ممتاز فرمایا تھا، میں اس قدر نادم اور شرمندہ ہوں کہ خط لکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی، روز یہ خیال کرتا، کہ آج شاہجہاں پور ضرور روانہ ہوجاؤں گا، مگر افسوس کہ ابتک یہ ارادہ پورا نہ ہوا، اور جواب گرامی نامہ میں بھی اس قدر تاخیر ہوگئی،

دو روز سے رات دن مشغول ہوں، اور آج شام کو مرادآباد جانا ہے کہ وہاں جمعیۃ عاملہ کا

جلسہ ہے، اور ممکن ہے کہ وہاں سے کلکتہ بھی جانا پڑے۔

جب یہ بات قطعی ہوگئی کہ اب دسمبر کے مہینے میں شاہجہاں پور جانا نہ ہوسکے گا تو آج یہ عریضہ لکھنے کا ارادہ کیا، اور سخت ندامت کے ساتھ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے حکیم صاحب کے تفکر اور تردد کا بیحد خیال ہے، اور ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہوں، مگر انسان اپنے ارادوں میں مجبور ہے۔ اب ۱۰ جنوری تک کے لیے آخری مہلت اور چاہتا ہوں، اگر حکیم صاحب منظور فرمائیں تو میں سعی کروں گا کہ دہلی آل مسلم پارٹیز کے جلسہ سے جو یکم و ۲ جنوری کو دہلی میں ہوگا، فارغ ہو کر وطن جاؤں اور فیصلہ کرکے حکیم صاحب کو اطلاع دوں، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، رفقائے دارالمصنفین سے سلام فرمادیں۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ

کوچہ چیلان دہلی

۱۳ جون ۱۹۲۹ء

مولانا المحترم دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ چھ روز ہوئے کہ میں نے ایک خط میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے درجۂ حدیث و تفسیر کے امتحان کے پرچے بنانے کے بارے میں ہدایات طلب کی تھیں آج جواب کا انتظار تھا، نہیں آیا، وقت کم رہ گیا ہے، بواپسی مطلع فرمادیں، ورنہ میں ۱۸ جون کو پرچے بنا کر روانہ کردوں گا۔

امید ہے کہ مزاج اقدس مع الخیر ہوگا۔

خادم

محمد کفایت اللہ غفرلہ

۸ جولائی ۱۹۲۸ء

محترم مولانا دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آج کی ڈاک میں مسلم و بیضاوی کے پرچے بصیغۂ رجسٹری واپس کردیے گئے نتیجہ کی اہم وار فہرست بھی انھیں پرچوں کے ساتھ رکھ دی ہے، سوالات کے دونوں پرچے بھی واپس کردیے گئے ہیں۔

طلبہ کی حالت پر اظہار رائے نہ کرسکا، اگر ارشاد ہوگا تو علیحدہ لکھکر بھیجدوں گا، امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا،

محمد کفایت اللہ غفرلہ

۱۶ ستمبر ۱۹۲۹ء

مولانا المحترم دامت مکارمکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب کا گرامی نامہ موجب افتخار و امتنان ہوا تھا، میں روز ارادہ کرتا تھا کہ آج جواب لکھوں کل لکھوں، یہانتک کہ اس قدر تاخیر ہوگئی، کرم ہائے متوالیہ سے امید ہے کہ اسکو بھی معاف فرمائیں گے۔

مولانا المکرم۔ مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ علماء بحیثیت جماعت سیاسیات میں دخل دیں یا نہ دیں، جو جماعت کہ علما کے وجود کو ہی اپنی مطلق العنانی کے لیے سخت خطرہ تصور کرتی ہے، اور جس کی نظر میں شرعی اوامر و نواہی ہی دور حاضر کی ترقی کے لیے سنگ راہ ہیں اور جو مذہبی اعمال، مذہبی وضع کو دقیانوسی اعمال اور بوسیدہ وضع سمجھتی ہے، وہ بہر صورت ان کے استیصال کے درپے رہے گی، کسی سیاسی مسئلہ کا اختلاف تو ایک بہانہ بنجاتا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اب انھیں اس بہانے کی بھی ضرورت نہیں رہی، مثال کے لیے نگار کے مضامین ملاحظہ ہوں، نیز فتنۂ افغانستان میں بغیر کسی تحقیق و تفتیش واقعات کے جو طوفان اٹھایا گیا، یا جس طرح علماء کے خلاف زہر افشانی کی گئی یہ سب میرے خیال کی مؤید ہیں۔

اگر علما اجتماعی حیثیت سے سیاسیات سے علیحدہ بھی ہو گئے، تاہم انفرادی شرکت تو جناب بھی تجویز فرماتے ہیں، تو اس انفرادی شرکت کی صورت میں کوئی عالم ایک جماعت کے ساتھ شریک ہوا تو مخالف جماعت اس کی حیثیت کو گھٹانے کے لیے کیا صرف اس فرد واحد کا خلاف کرے گی، بلکہ اس ایک کی وجہ سے ساری جماعت علما کو ہی برا بھلا کہے گی، اور اس کا استدلال یہی ہوگا کہ مولوی سارے کے سارے خر دماغ، بیوقوف ہیں، اس لیے ان کے افراد کی رائے بھی کسی طرح قابل وقعت نہیں، اس طرز عمل سے ان کی غرض یہ ہوگی کہ عالم کی شرکت سے عوام پر جو اچھا اثر ہو جاتا ہے اس کو زائل کر دیا جائے، اور دونوں سیاسی متخالف جماعتوں کی طرف سے یہی عمل ہوگا، کیونکہ کچھ کچھ علما دونوں جانب ہوں گے، تو نتیجہ یہی ہوگا جو اس وقت پیش نظر ہے، میں نے اگست کے معارف میں جناب کا شذرۂ معہودہ پڑھا، مگر میری رائے میں اس کا علاج اگر ہے تو علما کا اتفاق و اتحاد ہے، ورنہ اور کوئی صورت ان کے فلاح کی نہیں۔ اور علما کا اتفاق و اتحاد اگر اغراض شامل نہ ہوں تو کوئی مشکل امر نہیں ہے، مگر اغراض نفسانیہ کا برا ہو کہ یہ کسی طرح بھی اتحاد نہیں ہونے دیتے، اگر جناب والا کوئی ایسی تجویز فرمائیں جو علما کو متفق اور متحد کر سکے تو یہ امت مرحومہ کے اور طبقۂ علما کے ساتھ مسیحائی کا کام دے گی۔

فتنۂ صدارت اجلاس کانپور

کانپور کے مجوزہ سالانہ کی صدارت کے ضمن میں جو فتنہ برپا کیا جا رہا ہے، یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو ملت میں مضمون "ہم۔ یعنی علمائے کرام" میں جناب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

بہرحال خدا انتہائی رحم فرمائے اور جمعیۃ کو خود اعضائے جمعیت کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچائے، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا۔ رفقائے دار المصنفین کی خدمات مبارکہ میں سلام عرض ہے، حکیم محمد اسحٰق صاحب سے بھی سلام فرما دیں، اور کار لائقہ سے یاد فرماتے رہیں۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

جناب محترم دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ ۳-۴-۵ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے، ہندوستان کی موجودہ حالت بےحد نازک اور صحیح رہنمائی کی محتاج ہے، اس سے پہلے کبھی اتنی شدید ضرورت پیش نہ آئی ہوگی، جو اس وقت درپیش ہے، علاوہ سیاسی نازک ترین صورت حال کے اندرونی فتنہ بھی سامنے ہے کہ دوسری جماعت نے "توسیع نظام علما" کے نام سے ان ہی تاریخوں میں امروہہ میں دوسرے جلسہ کا انتظام اور اعلان کیا ہے، جمعیۃ کے جلسہ کو ناکام کرنے کی انتہائی کوشش ہو رہی ہے، اس لیے بصد ادب گذارش ہے کہ جمعیۃ علما کو اپنے زریں مشورے سے فائدہ پہنچانے اور اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس جلسہ میں ضرور شرکت فرمائیں۔ امید کہ یہ مخلصانہ گذارش ضرور مسموع اور مقبول ہوگی۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

۱۷ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء
۱۳۵۲

مخدوم محترم دام فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عنایت نامہ ۱۵ نومبر کو ملا، مجھے چونکہ کانپور کے جلسے کی نوعیت کا پورا علم نہ تھا، اس لیے میں نے ماسٹر ہلال احمد ایڈیٹر الجمعیۃ سے دریافت کرنے پر تحریر جواب کو ملتوی کیا۔ رات ماسٹر ہلال احمد سے معلوم ہوا کہ اخبار وحدت روزانہ جو مولوی مظہر الدین صاحب کا اخبار ہے، مورخہ ۱۷ نومبر کے صفحہ ۴ پر خود مولوی مظہر الدین کی جانب سے یہ اعلان ہے کہ

"موتمر تحفظ حقوق شرعی یعنی آل انڈیا قضا کانفرنس کانپور کی صدارت مولانا عبد القدیر صاحب بدایونی فرمائیں گے۔"

نیز اسی اعلان میں یہ الفاظ بھی ہیں :-

"مسلمانان کانپور کے جلسۂ عام منعقدۂ ۱۲ نومبر جو حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، مرکزی جمعیۃ علمائے ہند مسرکی والان دہلی سے درخواست کی ہے کہ یہ کانفرنس اس کی تحریک پر ہو رہی ہے، لہٰذا وہ خصوصیت سے شرکت و تعاون کرے"

کانپور سے میرے یا مولانا احمد سعید صاحب کے نام کوئی دعوتی خط نہیں آیا ہے، یہ قضا کانفرنس غالباً گذشتہ رات کو ہو بھی چکی ہوگی، یا آج کسی وقت ہو جائے گی، اور آج ۱۷ نومبر اس کی تاریخ و وقت کا کوئی اعلان نہیں دیکھا، بہرحال اس وحدت کے اعلان سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ صدارت کا قصہ تو یکسو ہوگیا، نیز یہ بھی کہ گو قضا کانفرنس کی صورت بظاہر بدل لی تھی، مگر جمعیۃ مسرکی والان دہلی سے ہی وہ متعلق تھی،

جناب کے سفر افغانستان اور اس سے کامیاب و بخیریت مراجعت پر دلی مسرت ہوئی، مگر افغانستان کا یہ حادثۂ ہائلہ سخت المناک ہے، حق تعالیٰ افغانوں کو رشد و ہدایت نصیب کرے اور قومی فلاح اور نعمت استقلال کو وہ حمیت و عصبیت خاندانی پر ترجیح دیں، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا، رفقائے دارالمصنفین کو اور حکیم محمد اسحاق صاحب کو سلام فرما دیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

مدرسۂ امینیہ دہلی

۱۰ مارچ ۱۹۳۶ء

حضرت محترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ خاکسار انتہائی مسرت کے ساتھ آں محترم کی خدمت اقدس میں پُر خلوص مبارکباد پیش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جناب والا کو صحت عطا فرمائی

رب العزت جل شانہٗ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مسلمانان ہند کے لیے فیوض علمیہ و عملیہ آں محترم سے متمتع ہونے کا سلسلہ جاری رکھا، اور دعا ہے کہ تا دیر آں محترم کی فیض رسانی جاری رہے۔ آمین آمین۔ رفقائے دارالمصنفین کی خدمات مبارکہ میں سلام عرض ہے، اور جناب حکیم محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں بھی۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

۱۴ اپریل ۱۹۳۶ء

حضرت مخدوم محترم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مکرمت نامہ نے عزت افزائی فرمائی، میری کیا خصوصیت ہندوستان کے تمام علمی، ادبی حلقے آں مکرم کی درازیٔ عمر و امتداد ظل فیوض علمیہ کے متمنی اور بارگاہ احدیت میں آں جناب کی صحت و سلامتی کے لیے داعی و ملتجی تھے اور ہیں، اور رہیں گے، مژدۂ صحت جناب والا نہ صرف عوام مسلمین ہند کے لیے بلکہ علماء و فضلاء اور باکمال ماہرین کے لیے ایک نوید جانفزا بنکر موجب سجدہ ریزی شکر باری تعالیٰ و تقدس ہوا،

رب العزت آپ کے سایۂ افاضات علمیہ کو تا دیر قائم رکھے، آمین۔ امید ہے کہ قیام دہرہ دون صحت کے لیے مفید ہوگا۔ رفقائے دارالمصنفین کی خدمت عالیہ میں سلام شوق۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

۳۱ دسمبر ۱۹۳۶ء

مکرم محترم جناب مولانا السید سلیمان صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ مکرمت نامہ نے سرفراز فرمایا، دسمبر ۳۶ء کا معارف بھی پہنچا۔

یہ افسوسناک خبر کہ امداد صابری صاحب نے جناب کو ازالۂ حیثیت عرفی کا نوٹس دیا ہے، میرے لیے سوہان روح ہوگئی،

میں نے معارف کا وہ شذرہ بھی پڑھا جس پر اس نوٹس کی بنیاد ہے، اگر وہ یہی ہے جو معارف بابت دسمبر ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۴۰۴ پر مندرج ہے تو میرے خیال میں اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ درست نہیں،

اللہ تعالیٰ بہتر کرے، اور مسلمانوں کو راہ راست اور عرفان قدر کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور ذات گرامی کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

۱۷ر نومبر ۱۹۴۰ء

مولانا المحترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، اس وقت ایک خاص ضرورت سے مکلف ہوا ہوں، وہ یہ کہ مسلم یونیورسٹی میں مولانا ابوبکر شیث کی جگہ افسر دینیات کا معاملہ زیر غور ہے۔ مولوی سید فخر الحسن صاحب مدرس مدرسہ فتحپوری بھی امیدوار ہیں، انٹرویو میں وہ شامل تھے، آدمی بہت لائق ذی استعداد اور صالح ہیں، اگر ان کے تقرر کی صورت ہوسکے تو وہ اس خدمت کے اہل ہیں، میں تو آج تک کورٹ کی میٹنگ میں شریک نہ ہوسکا، جناب کچھ سعی فرماسکیں تو دریغ نہ فرمائیں۔

مولانا احمد سعید صاحب کل ۱۸ر کو دہلی سے روانہ ہوں گے،

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

مطبوعات جدیدہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ۔ از شیخ ابوزہرہ ترجمہ رئیس احمد جعفری صفحات ۸۸۲، کتابت وطباعت بہتر، ناشر المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور، قیمت ۲۱ روپے۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندوستان میں امام ابن تیمیہ کی شخصیت زیادہ معروف نہیں تھی، اہل علم کا جو حلقہ واقف تھا، ان میں بھی معتدبہ تعداد ان کے افکار و خیالات کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھی، جس کی وجہ سے ان کے علم و فضل اور مجددانہ اور مجتہدانہ کارناموں پر پردہ پڑا ہوا تھا، سب سے پہلے مولانا شبلی اور مولانا آزاد اور اسکے بعد علمائے اہل حدیث کی کوششوں سے انکی شخصیت عام لوگوں میں معروف ہوئی اور غلط فہمیوں کے پردے چاک ہوئے، اور اب ہندوستان کے اہل حق کا مشکل ہی سے کوئی طبقہ ہوگا جس کا دل ان کی محبت وعقیدت سے لبریز نہ ہو، اس مدت میں امام کی متعدد سوانح عمریاں شائع ہوئیں، جن میں بعض بہت ضخیم اور برسوں کی محنت کے بعد لکھی گئی ہیں، مگر اس موضوع پر شیخ ابوزہرہ نے جو داد تحقیق دی ہے، اس میں ان کا کوئی پیش رو مشکل سے شریک وسہیم بن سکتا ہے، شیخ نے نہ صرف ان کی مفصل سوانح حیات لکھی ہے، بلکہ انکے علم وفضل اور افکار و اجتہادات پر پورے مالہٗ وما علیہ کے ساتھ بحث کی ہے، اور جہاں جہاں امام نے دوسرے ائمہ مجتہدین سے اختلاف کیا ہے، اس کی بدلائل وضاحت کی ہے، ساتھ ہی انکے تفردات کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور امام صاحب کی طرف جو باتیں غلط طور پر منسوب ہیں، ان کی بھی تردید یا توجیہ کی ہے، خاص طور پر نزول باری کے مسئلہ میں ابن بطوطہ نے جو غلط فہمی پھیلائی ہے

اس کی بڑی مدلل تردید کی ہے،

ائمہ اربعہ کی سوانح حیات کے بعد یہ کتاب ابوزہرہ کا بڑا کارنامہ ہے، کتاب پر مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے مفید حواشی ہیں، مگر اپنے مسلک کے خلاف جو باتیں مولانا کو نظر آئیں ان میں امام کا ساتھ انھوں نے نہیں دیا ہے، مثلاً رجوع ہبہ کے مسلک میں، ہر حال یہ کتاب شائع کرکے المکتبۃ السلفیہ نے ایک بہت ہی مفید کام انجام دیا۔

علی برادران۔ از رئیس احمد جعفری، صفحات ۴۲۰، کتابت وطباعت بہتر، ناشر محمد علی اکیڈمی لاہور، قیمت ۱۵ عہ

مولانا محمد علی مرحوم میں جو گوناگوں خصوصیات تھیں اور ان کے جتنے متنوع کارنامے ہیں، اس کی مثال کسی دوسرے مسلمان لیڈر میں نہیں مل سکتی، ان کو جو مقبولیت ومحبوبیت مسلمانوں میں حاصل ہوئی، وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، ان کی سب سے بڑی خصوصیت وطنیت وقومیت اور دینی غیرت وحمیت کی جامعیت تھی، انھوں نے ان میں سے کسی کے حق کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا، وہ ایک طرف کٹر مسلمان تھے، دوسری طرف پکے ہندوستانی، وہ جنگ آزادی کے نامور قائد بھی تھے اور دین وملت کے مجاہد بھی، اس کے لیے ان کو اپنوں سے جنگ کرنا پڑی اور اپنے ننگ وناموس تک کی پروا نہ کی لیکن دین وملت کا دامن ان کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا، ان کی وطنی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ایک زمانہ تک وہ جنگ آزادی کے قافلہ کے سالار رہے، اس تحریک میں ان ہی نے جان ڈالی تھی، اور اس راہ میں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، لیکن ہندوستان نے ان کو بہت جلد بھلا دیا، اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کو بھولتے جاتے ہیں، اس لیے جب ان کی یاد میں کہیں سے کوئی آواز اٹھتی ہے تو بڑی قابل قدر معلوم ہوتی ہے، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ مولانا مرحوم کے پہلے سوانح نگار نے، مذکورۂ بالا کتاب مرتب کرکے مسلمانوں کا ایک فرض کفایہ ادا کیا ہے،

یہ کوئی مرتب سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک کشکول کی ہے، جس میں علی برادران کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہیں، جو کسی ایک کتاب میں ایک جگہ نہیں مل سکتے، اس سے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کے ہر رخ کی جھلک نگاہ کے سامنے آجاتی ہے، لکھنے والوں میں مختلف طبقوں کے موجودہ اکابر کے مضامین ہیں، اگر ان میں کچھ پرانے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں کے تاثرات بھی نقل کر دیے جاتے تو اس کتاب کا وزن اور بڑھ جاتا، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی کا اچھا مرقع ہے، اور محمد علی اکیڈمی نے اس کو شائع کرکے ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔

روائع اقبال۔ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، صفحات ۱۲۶، ٹائپ بہتر، ناشر دار الفکر دمشق

علامہ اقبال کو عرب دنیا سے روشناس کرانے کی غالباً سب سے پہلی کوشش عبد الوہاب عزام پاشا مرحوم سابق سفیر مصر نے کی یعنی انھوں نے ان کے فارسی اشعار کا عربی اشعار میں ترجمہ کیا، کسی زبان کی شاعری کو دوسری زبان کی شاعری میں منتقل کرنے پر خواہ کتنی ہی زیادہ قدرت کیوں نہ ہو، پھر بھی ضرورت شعری کی خاطر شاعر کے اصل جذبات کو کہیں کہیں مجروح ہی کرنا پڑتا ہے، اس لیے اس کے لیے نثر کی زبان زیادہ موزوں ہوتی ہے، جس میں نہ صرف اشعار کا اچھے سے اچھا ترجمہ کرنے کا موقع ہوتا ہے، بلکہ اس میں شاعر کے فکر ونظر کے پس منظر کو سامنے لانے کا موقع بھی ملتا ہے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عربی زبان کے ادیب علی طنطاوی کی تحریک اور اقبال سے اپنے طبعی شغف کے نتیجہ میں روائع اقبال کے ذریعہ اقبال کی شاعری کو نثر میں عرب دنیا تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے اس میں ان کی ایک درجن کے قریب اہم نظموں کا بہترین عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے، اور اس کی پوری کوشش کی ہے کہ اقبال نے جن دردمندانہ جذبات وتاثرات کے ساتھ اشعار کہے ہیں، سامع کے دل ودماغ میں بھی وہی تاثرات پیدا ہوں، مولانا اور دوسرے حضرات

کی یہ سعی اس حیثیت سے سعی مشکور ثابت ہوئی کہ عرب دنیا جو علامہ اقبال کو ٹیگور سے بھی کم جانتی تھی، اب ان سے پورے طور پر نہ صرف روشناس ہو چکی ہے، بلکہ ان کی گرویدہ ہے۔

آہنگ حیات۔ از محمد منشاء الرحمن صاحب منشاء، مرتب محمد قمر الدین صاحب صابری
صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر بیت الاشاعت چھاؤنی ناگپور

محمد منشاء الرحمن صاحب منشا جدید دور کے ممتاز شعراء میں ہیں، ان کی غزلیں اور نظمیں اردو کے تمام ہی قابل ذکر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں، اب پہلی بار ان کا مجموعہ آہنگ حیات شائع ہوا ہے، ان کو نظم و غزل دونوں میں یکساں قدرت ہے، مگر غزل سے ان کو فطری مناسبت ہے، اس لیے ان کی نظموں میں غزل کا سا درد و سوز اور غزلوں میں نظم کا توازن و تسلسل محسوس ہوتا ہے، ظاہری و معنوی شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ان کا کلام جدت و قدامت کے امتزاج کا بھی بہترین نمونہ ہے، انھوں نے جدید رجحانات اور اس دور کے تقاضوں سے صرف نظر نہیں کیا ہے، مگر ان کی نظمیں نہ تو ترقی پسندوں کی آشفتہ خیالی کی نذر ہونے پائی ہیں اور نہ غزلوں کی "شان رعنائی" مجروح ہونے پائی ہے، یوں تو پورا مجموعہ بار بار مطالعہ کے لائق ہے، مگر ان کی بعض غزلیں اور نظمیں تو بے مثال ہیں، بعض الفاظ اور ترکیبیں محل نظر ضرور ہیں، مگر اس سے ان کے کلام کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لمحات۔ از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، صفحات بہتر، ٹائپ عمدہ، ناشر شاہ ولی اللہ
اکیڈمی صدر حیدرآباد (پاکستان) قیمت عہ/

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ، تصوف اور اسرار معرفت ربانی پر جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایک لمحات بھی ہے، یہ کتاب گویا ان کے فلسفہ کا خلاصہ اور روح ہے، مگر اب تک اشاعت سے محروم تھی، مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی کو جو اس سے پہلے بھی شاہ صاحب کے بعض اور رسائل کو مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں، اس کا ایک نسخہ قاری خان محمد شاہ پوری صاحب

کراچی کے یہاں دستیاب ہو گیا، جسے انھوں نے جامعہ ملیہ کے اصل نسخہ اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا ہے، ایک یادگار کے طور پر اسکی اشاعت ایک مفید کام ہے۔

انڈونیشیا۔ از شاہد حسین رزاقی، صفحات ۲۸۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر
ادارۂ ثقافت اسلامیہ، پاکستان، قیمت عہ/

انڈونیشیا ہمارا قریبی پڑوسی ملک ہے، مگر ہندوستانی زبانوں میں اس پر اتنا کام بھی نہیں ہوا ہے، جتنا انگریزی میں ہوا ہے، انگریزی میں دو درجن سے زیادہ ضخیم کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، شاہد حسین صاحب رزاقی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو زبان میں ایک تحقیقی کتاب پیش کرنے کی پہلی کوشش کی ہے، کتاب میں کل بیس ابواب ہیں، جن میں انڈونیشیا کی قدیم تاریخ، اسلام کے داخلہ، پرتگالیوں کی یورش، اور اس کی حکومت سے لیکر جدید عہد کی سیاسی تبدیلیوں اور سیاسی تحریکوں تک پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس کتاب کے مرتب کرنے میں مصنف نے نہ صرف انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ ملک کی بہت سی زندہ شخصیتوں سے ملکر بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی اشاعت پر مصنف کے ساتھ ادارۂ ثقافت بھی قابل مبارکباد ہے۔ "م - ح"

روزگار فقیر کا پتہ

پچھلے مہینہ میں روزگار فقیر پر جو تبصرہ نکلا تھا، اس میں سہواً اس کا پتہ درج ہونا رہ گیا، ناظرین اس کا پتہ نوٹ کر لیں۔

فقیر اسپننگ ملز لمیٹڈ ۳۶-۱ کیمبل اسٹریٹ
کراچی

فارم IV
دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	" "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۴ء عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ